1857ء کے انقلاب کا عینی شاہد
جارج پیش شور
ڈاکٹر راحت ابرار

1857ء کے انقلاب کا عینی شاہد
جارج پیش شور

ڈاکٹر راحت ابرار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

1857 Ke Inquilab Ka Aini Shahid
George Puech Shor

by

Dr. Rahat Abrar

Year of Ist Edition 2010
Year of IInd Edition 2011
ISBN 978-81-8223-738-4
Price Rs. 250/-

نام کتاب	:	1857 کے انقلاب کا عینی شاہد جارج پیش شور
مصنف	:	ڈاکٹر راحت ابرار
سنِ اشاعت اول	:	۲۰۱۰ء
سنِ اشاعت دوم	:	۲۰۱۱ء
قیمت	:	۲۵۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنی شریک حیات شمیم عصمت کے نام
جنہوں نے اس تصنیف کی تکمیل کی خاطر
اپنا وقت میرے اوپر نچھاور کیا

راحت ابرار

فہرست ابواب

☆☆
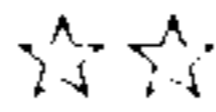
حرفِ چند

ڈاکٹر راحت ابرار اور میرے درمیان رابطۂ رفاقت کا واحد ذریعہ وہ چند حوالے تھے جو میری کتاب 'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' میں جارج پیش شور کی شاعری کے بارے میں آئے تھے، پھر جب جون 2009 میں ڈاکٹریٹ کے لیے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گیا تو ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ حد درجہ فعال شخص ہیں اور گہرا علمی شغف رکھتے ہیں۔ ادھر انھوں نے جارج پیش شور کی غیر مطبوعہ تصنیف 'وقائع حیرت افزا' جو 1857 کے واقعات کے بارے میں ہے اس کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ کتاب شورشِ انقلاب 1857 کے عینی شاہد کے طور پر لکھی گئی تھی۔ فرنگیوں کے کچھ خاندان اس زمانے میں دہلی سے قریب میرٹھ کے نواح میں آباد تھے، ان میں جارج پیش شور کا خاندان بھی تھا۔ ہنگامے کے زمانے میں وہ خود بھی مقامی جاٹوں کے ہاتھوں مسائل و مصائب کا شکار رہے۔ یہ ڈائری انھوں نے انقلاب 1857 میں انگریزوں کی فتح کے بعد رجب علی بیگ سرور کے اسلوب میں قلم بند کی۔ وہ اسے 1862 میں شائع بھی کرانا چاہتے تھے لیکن یہ شائع نہ ہو سکی۔ تب سے اب تک یہ غیر مطبوعہ تھی۔

ڈاکٹر راحت ابرار نے جارج پیش شور کے حالاتِ زندگی، ان کی تاریخی، ادبی اور شاعرانہ اہمیت پر تفصیلی تحقیقی ابواب لکھے ہیں۔ یوں انھوں نے عہد غالب کی ایک اہم گمشدہ کڑی کو جوڑ دیا ہے جس کے لیے تاریخ ادب اردو ان کی ہمیشہ ممنون رہے گی۔

گوپی چند نارنگ

حرفِ آغاز

1857ء کا انقلاب ہندوستان کی سیاسی، ادبی اور ثقافتی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس انقلاب کے ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی تاریخی اہمیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ان ڈیڑھ سو سالوں میں ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں اور تحقیقی مقالے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نئی نئی معلومات منظرِ عام پر آ رہی ہیں مگر افسوس کہ کسی بھی مورخ، محقق، ادیب اور صحافی نے اس عرصہ میں جارج پیش شور کی تصنیف پر کام نہیں کیا۔

زیرِ مطالعہ کتاب انیسویں صدی کے فرانسیسی نسل کے شاعر اور ادیب جارج پیش شور کی غیر مطبوعہ ڈائری ''وقائع حیرت افزاء'' کے حوالے سے 1857ء کے انقلاب کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

شور خود اس انقلاب کا عینی شاہد ہے اور ایک فرنگی ہونے کے ناطے وہ ان مظالم و مسائل کا شکار بھی رہا ہے۔ خود اس کے نانا اور اردو کے پہلے جرمن شاعر فرانسس کوئن فراسو کو اس علاقے کے عظیم مجاہد شاہ مل جاٹ نے یرغمال بنا لیا تھا۔ فراسو نے بھی 1857ء کو فارسی زبان میں منظوم تاریخ ''فتح نامۂ انگریز'' کے طور پر پیش کیا ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ باغپت کے علاقہ کے انقلابی کسانوں کی حرکت و عمل کی وجہ سے جارج کو کسی طرح اپنی جان بچا کر میرٹھ میں پناہ لینی پڑی تھی۔

جارج پیش شور نے ایک وقائع نگار کی حیثیت سے 10 رمئی 1857ء کی شورش سے ایک ہفتہ قبل یعنی یکم مئی سے دلی کی سماجی اور ثقافتی زندگی کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

جارج نے 1857ء کے تقریباً پانچ ماہ کے حالات، حادثات اور واقعات کو سلسلہ وار لکھا ہے۔ خاص طور سے میرٹھ کے کسانوں کی پنچایتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہ

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ 1857ء کا واقعہ محض ایک فوجی بغاوت نہیں تھا بلکہ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں کسانوں اور علماء نے بھی قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ وہ جہاد کو ایک مقدس فریضہ تصور کرتا ہے مگر 1857ء میں جس طرح معصوم اور بے قصور افراد کا قتلِ عام کیا گیا اس کو وہ فتنہ وفساد سے تعبیر کرتا ہے۔

اس ڈائری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جارج پیش شور خود میرٹھ میں رہ رہے تھے اور ہنگامہ ختم ہونے کے بعد دوستوں کی فرمائش پر انہوں نے یہ کتاب لکھی۔ وقائع حیرت افزاء میں انہوں نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرز تحریر کو اپنایا اور فسانۂ عجائب کی طرح 1857ء کے واقعات، حالات اور حادثات کو لکھ کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ فاضل وقائع نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ ''شائق اس کو جب پڑھیں گے دیگر کتاب بابِ سوانحۂ غدر کو طاق میں دھریں گے۔ بہت جان و دل کو اس نسخہ کی فکر میں گنوایا ہے تب یہ مضمونِ پسندیدہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقاتِ عزیز کو کچھ فضول و بے کار نہیں کھویا ہے بلکہ گلدستۂ پُر بہارِ معنی کو گلشنِ سخن میں اچھی روش پر بویا ہے۔''

شور اردو زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ شاعری کے فن اور اس کے رموز سے کما حقہٗ واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ شور کے کلام میں مختلف عہد کے مختلف شعراء کا اثر غالب ہے۔ ان کی شاعری میں سودا، میر، درد، انشاء، ظفر، غالب، رند، مومن، آتش، قلق، نسیم، ناسخ وغیرہ سبھی استاد شعراء کے انداز بیان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شور نے چار پانچ دیوان اپنی زندگی ہی میں شائع کرادیے تھے۔ شاعری میں انہوں نے غزلیات کے علاوہ مثنویاں، رباعیاں، قطعات، قصائد، مسدس، مخمس اور سہرے لکھے اور اپنی قادرالکلامی کا ثبوت فراہم کیا۔ حضرت داغ نے انہیں مالک ملک سخن قرار دیا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 1857ء کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جو ابھی تک کسی وجہ سے منظر عام پر نہیں لائے جا سکے۔ اس کتاب میں اردو کے ساتھ ساتھ تحقیقی مواد بڑی تعداد میں ہندی اور انگریزی کتابوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور یہ جدوجہد سے متعلق نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

راحت ابرار

باب اوّل

میرٹھ اور 1857ء

ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں 1857ء ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی نے اس کو شورش قرار دیا تو کسی نے غدر اور فوجی بغاوت سے تعبیر کیا۔ ملک کی آزادی کے بعد سے 1857ء کو آزادی کی پہلی جنگ یا قومی تحریک کے عنوان سے پکارا جاتا ہے۔ غرض کہ ڈیڑھ سو سال قبل 9رمئی 1857ء کو جو فوجی بغاوت میرٹھ سے شروع ہوئی وہ انقلاب کا پہلا نقیب اور جنگ آزادی کی پہلی آواز تھا۔

ملکی اور غیر ملکی مورخ 1857ء کی بغاوت کی ماہیت کے بارے میں جتنی بھی بحث کریں لیکن ہندوستان کے عوام یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ میرٹھ کی یہ بغاوت ہماری قومی تحریک کا سرچشمہ ہے۔

خود فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس نے تسلیم کیا ہے کہ '' حکومت ہند کے سرکاری کاغذات میں مسٹر فارسٹ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کارتوسوں کی تیاری میں جو روغنی محلول استعمال کیا گیا تھا، واقعی وہ قابل اعتراض اجزاء یعنی گائے اور سور کی چربی سے مرکب تھا اور ان کارتوسوں کی ساخت میں فوجیوں کے مذہبی تعصبات اور جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کی گئی[1]۔

1857ء کے اس خونیں انقلاب میں میرٹھ کے 85 بہادر سپاہیوں نے پوری دنیا کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد، جذبۂ ایثار، مادرِ وطن کی خاطر مذہبی اتحاد اور رواداری کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ گائے کا گوشت کھانے والے اور گائے کی پوجا کرنے

والے، لا الہ اللہ محمد الرسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والے مسلمان اور منتروں کا جاپ کرنے والے ہندوؤں نے مل کر بغاوت کی[2]۔

میرٹھ چھاؤنی سے جو بھی سپاہی ملک کے کسی حصہ کی طرف کوچ کرتا تھا وہ نعرہ لگاتا ہوا کہتا تھا کہ ''بھائیو! ہندو اور مسلمانو!! انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر کرو'' انقلابیوں کے اس حقارت آمیز نعرے میں تین الفاظ اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے یعنی ''ہندو اور مسلمان''۔ ان تین الفاظ میں اس بات کی تلقین کی جارہی تھی کہ ہندو اور مسلمان مل کر یہ قومی جنگ لڑیں کیونکہ اس کے بغیر غلامی سے نجات نہیں ہوسکتی۔ اس اعلان کے بعد پورے ہندوستان میں انقلاب کی لہر دوڑ گئی۔

میرٹھ کے فوجیوں میں انقلاب کی روح پھونکنے والا شخص عبداللہ بیگ نام کا ایک برطرف فوجی افسر تھا جس نے اپنے ہم وطن فوجی ساتھیوں سے کہا تھا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کارتوس تمہیں دئے جارہے ہیں ان میں سؤر اور گائے کی چربی لگی ہوئی ہے اور سرکار تمہاری ذات بگاڑنے کی خواہش مند ہے۔ میرٹھ فوج کے دو مسلم سپاہی شیخ پیر علی نائک اور قدرت علی نے سب سے پہلے 23/ اپریل 1857ء کی رات کو ملٹری میس میں ایک خفیہ میٹنگ کی اور اسی وقت ہندو اور مسلم فوجیوں نے مقدس گنگا اور قرآن شریف کی قسمیں کھا کر حلف لیا کہ وہ اس کارتوس کا استعمال نہیں کریں گے[3]۔ 24 اپریل 1857ء کو فوجی پریڈ گراؤنڈ پر نوے فوجیوں میں سے 85 فوجیوں نے جن میں سے اڑتالیس مسلمان اور 37 ہندو تھے کمپنی کمانڈر کرنل اسمتھ (Smyth) کے سامنے اعلان کردیا کہ وہ چربی والے کارتوس اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے جب تک کہ وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوجاتے[4]۔ چنانچہ ایک فوجی عدالت میں ان سپاہیوں کو پیش کیا گیا اور جابر فوجی عدالت نے تمام سپاہیوں کو دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی۔ سپاہیوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی جو جنرل ہیوٹ (Hewitt) نے مسترد کردی[5]۔

9/ مئی 1857ء کو ہندوستانی رسالے کی پلٹن کو میدان میں آنے کا حکم دیا گیا۔ چاروں طرف توپ اور گورا فوج تیار کھڑی تھی۔ پچاسی سپاہیوں کو ننگے پاؤں پریڈ کراتے

ہوئے میدان میں لایا گیا اور چار سپاہیوں کو وہیں گولی کا نشانہ بنادیا گیا اور بقیہ اکیاسی سپاہیوں کی وردیاں پھاڑ کر اتار دی گئیں، فوجی میڈل نوچ لئے گئے اور وہاں پہلے سے موجود لوہاروں سے ان باغی سپاہیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں[6]۔

جو سپاہی پلٹن میدان سے واپس آگئے تھے ان میں نفرت اور غصہ پھوٹ رہا تھا اور انہوں نے 10 رمئی کو اتوار کے دن جب سبھی انگریز فوجی افسر گرجا گھر میں اتوار کی عبادت کے لئے جمع ہو رہے تھے کہ یکایک چند جوشیلے نوجوانوں نے مشتعل ہوکر ہندوستانی سپاہیوں کی بیرکوں میں آگ لگا کر آزادی کی جدو جہد کا اعلان کردیا۔ کرنل فینس (Finnis) سب سے پہلے ان انقلابی سپاہیوں کی گولی کا نشانہ بنے[7]۔ اس کے بعد نو اور انگریزوں کو قتل کردیا گیا جن کی قبریں آج بھی میرٹھ۔ رڑکی روڈ پر واقع سینٹ جونس سیمٹری میں اس تاریخی واقعہ کی یاد دلاتی ہیں۔ حالانکہ بہت سے مورخین نے ہزاروں انگریزوں کے قتلِ عام کا حوالہ دیا ہے مگر میرٹھ کے قدیمی مسیحی قبرستان میں صرف دس قبریں ہیں جو دس مئی کے واقعہ کی خاموش گواہ ہیں۔

ان انقلابی فوجیوں میں جوش وجذبہ پیدا کرنے میں میرٹھ کے صدر بازار کی چار طوائف صوفیہ، مہری، زینت اور گلاب کو بھی بہت دخل ہے[8]۔ ان فوجیوں کو ان طوائفوں نے ہی وطن پرستی کے لئے انہیں للکارا تھا اور اس طرح 1806ء میں قائم میرٹھ کی فوجی چھاؤنی دیکھتے دیکھتے ہی انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوگئی۔

ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ ان عورتوں نے لعن وطعن وتشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نارۂ فتنہ وفساد کو بھڑکانا شروع کیا اور ان کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کرگئی۔ ان عورات نے مردوں کو طعنے دینے شروع کئے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہی گری کا دعویٰ کرتے ہو مگر نہایت بزدل بے عزت اور بے شرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی ہیں تم کو شرم نہیں کہ تمہارے سامنے افسروں کے ہتھکڑیاں، بیڑیاں پڑ گئیں مگر تم سے دیکھا گیا اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ یہ چوڑیاں تو تم پہن لو اور ہتھیار ہم کو دے دو ہم افسروں کو چھڑا لاتی ہیں۔

ان کلمات نے اشتعال طبع پیدا کیا...... مردانگی کی آگ بھڑک اٹھی اور مرنے مارنے پر تیار ہوگئے[9]۔ میرٹھ کے اس واقعہ نے عام بغاوت کی کیفیت پیدا کردی تھی اور آگ کی طرح یہ خبریں پھیل گئیں تھیں۔ میرٹھ چھاؤنی کی اس چنگاری نے دیکھتے ہی دیکھتے شعلۂ جوالہ بن کر پورے برِصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی دوران انقلابیوں نے میرٹھ سینٹرل جیل کے دروازے توڑ دیے، کھڑکیاں اکھاڑ پھینکیں اور ایک دن پہلے جیل میں قید اپنے ساتھیوں کو آزاد کرالیا۔ ان کے ساتھ تقریباً بارہ سو قیدی بھی جیل سے نکل بھاگے۔ بعض قیدی ہتھکڑی اور بیڑی لگے ہوئے وہاں سے چل دیے اور عبداللہ پور، بھاون پور، سیال، مبارک پور ہوتے ہوئے مان پور پہونچے جہاں کسی نے انگریزوں کے ڈر کی وجہ سے ان کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹنے کی ہمت نہیں کی۔ وہاں مان پور گاؤں کے ایک لوہار مہراب خاں نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان قیدیوں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹ ڈالیں اور ان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو کنویں میں ڈال دیا۔[10]

میرٹھ کے عالم مولانا سید عالم علیؒ اور ان کے بھائی سید شبیر علی جو صاحبِ کشف بزرگ تھے، دل کھول کر ان باغی سپاہیوں کی مدد کی۔ شاہ پیر دروازے سے نوچندی کے میدان تک ہزاروں جوان سربکف آتشِ سوزاں بنے ہوئے نبرد آزما دکھائی دے رہے تھے۔ یکایک کپتان ڈریک اسلحہ سے لیس ایک فوجی دستہ لئے ہاپوڑ روڈ پر نمودار ہوا اور ہجوم پر فائرنگ کردی۔ یہاں زبردست قتلِ عام ہوا۔ 11رمئی 1857ء کو بائیس حریت پسندوں کو نوچندی کے میدان میں پھانسی دے دی گئی جن میں سید عالم اور سید شبیر علی صاحبان بھی شامل تھے۔ شہر کے باشندے یہ خبر سن کر بھڑک اٹھے اور اسی دن سرکاری دفاتر کو نذرِ آتش کردیا۔ انتظامیہ مفلوج ہوگئی۔ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور دھوئیں سے آسمان نظر نہیں آرہا تھا۔[11]

میرٹھ کے ممتاز شاعر مولانا اسمٰعیل میرٹھی جو خود اس ہنگامے کے عینی گواہ تھے ان کے بیٹے محمد اسلم سیفی اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ’’دس رمئی 1857ء کا واقعہ ہے۔

ماہ رمضان المبارک کی 14 تاریخ اس دن تھی۔ پڑوس میں دعوت روزہ افطار کی تھی۔ مولانا اور دیگر اعزا اس میں شریک تھے۔ یکا یک ہولناک شور وغل کی آوازیں بلند ہوئیں۔

معلوم ہوا کہ جیل خانہ توڑ دیا گیا ہے اور قیدی بھاگ رہے ہیں۔ لوہار ان کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ شہر کے لوگ سراسیمہ ہر طرف رواں دواں نظر آرہے تھے۔ کثیر التعداد آدمی جیل خانہ کی سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ مولانا کے قلب پر اس ہنگامہ کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اس عظیم الشان ہنگامۂ دار و گیر کا تلاطم۔ دہلی کی تباہی کا نقشہ، اہلِ دہلی کا حالِ پریشان، ان باتوں نے مولانا کے دل و دماغ پر بچپن ہی میں ایسا گہرا اثر بٹھایا کہ آئندہ زندگی میں فلاح و بہبود و خلائق کے لئے بلا لحاظ دین وملت یا ذات پات مصروفِ کار رہے۔"[12] مولانا اسماعیل میرٹھی کے دل میں بھی آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
ہے وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

محمد غلام مولیٰ بخش قلق میرٹھی دلی کالج میں فارسی کے استاد مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد ہوئے۔ قلق نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دلی میں سکونت اختیار کر لی۔ 1857ء کے واقعات اور حادثات سے دل برداشتہ ہو کر اپنے وطن میرٹھ آگئے۔ ان ہنگاموں میں ان کے استاد مولانا امام بخش صہبائی اور ہم درس مولوی عبدالکریم سوز کو انگریزوں نے قتل کر دیا۔

میرٹھ میں آکر انہیں دہلی کی محفلوں کی تشنگی کا احساس رہا۔ خود لکھتے ہیں:

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو کیوں میرٹھ میں آرہتا
گدائی کے بھروسے پر لٹایا بادشاہی کو

میرٹھ میں ہے قلق تو مگر بلبل غریب
افسوس ہے کہ تیرا کوئی ہم زباں نہیں

میرٹھ میں انہوں نے اپنے استاد مومنؔ کا کلیات ترتیب دیا۔ اس کے بعد انہیں سر رشتہ تعلیم میں انگریزی کی اخلاقی نظموں کے ترجمے کا پروجیکٹ مل گیا۔ ان کے یہ ترجمے ''جواہر منظوم'' کے نام سے مرزا غالب کی نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں 1866ء میں شائع ہوئے۔ قلقؔ کے ان تراجم سے اردو کے بہت سے شعراء متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کی قدیم روش میں تبدیلی بھی کی جن میں اسمٰعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی شامل ہیں۔[13]

میرٹھ کے ہی سید حسین علی ابنِ سید مدد علی نبیرۂ حضرت بھلے شاہ سادات نو محلّہ سے تھے اور میرٹھ میں سرکاری فوج میں رسالدار تھے، وہ بھی باغیوں کی مدد کے لئے آگے آئے اور بعد میں بریلی کے نواب خان بہادر کی فوج میں شامل ہوگئے۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف انہوں نے اپنے گھر کی عزت بچانے کے لئے اپنی ماں بہنوں کو آمادہ کیا کہ وہ خاندانِ سادات کی عزت کی لاج رکھتے ہوئے کوئیں میں کود پڑیں۔ بعد میں وہ بھی شہید کردئے گئے۔[14]

مجاہدِ آزادی میوا رام گپت لکھتے ہیں کہ شہید والی خاں دیسی رجمنٹ نمبر گیارہ میرٹھ کے افسر تھے۔ انہوں نے سؤر کی چربی کی وجہ سے کارتوسوں کو داخل اسٹور کرنے کا مشورہ دیا جس پر انگریز افسر سے ان کی جھڑپ ہوگئی۔ انہوں نے افسر پر فائر کردیا جس کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہوگیا جسے غدر کا نام دیا گیا۔ والی خاں صاحب بہادر شاہ ظفر کے ہم شکل تھے، وہ جب میدان میں پہنچے تو عام شہرت ہوگئی کہ بادشاہ سلامت خود فوج کی قیادت کر رہے ہیں۔ فوج کے حوصلے بڑھ گئے، انگریزوں کی شکست ہوئی، دوسرے دن بھی انگریزوں کو ہار کا منھ دیکھنا پڑا لیکن تیسرے دن 13 ؍مئی کو میدانِ کارزار میں آپ شہید ہوگئے۔ والی خاں کا نام برٹش سرکار کے ریکارڈ میں ''**بانیٔ غدر 1857**'' کی حیثیت سے درج ہے۔[15]

کمشنر ایف ولیمز (F.Williams) نے میرٹھ کے ہنگاموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''گوجروں اور رہائی یافتہ مجرموں نے فوراً رہزنی اور لوٹ مار شروع کردی، سڑکوں

کو بند کر دیا گیا، ڈاک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ 11 اور 12 رمئی کو رانگھڑوں (مسلم راجپوت) اور راجپوتوں نے تحصیل سردھنہ پر حملہ کر دیا۔ قلندر خاں نام کے حولدار نے فوراً اپنے آپ کو حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا۔[16]

میرٹھ کے عوام نے ان انقلابی فوجیوں کی بھرپور مدد کی اور ایک ہی دن میں یہ بغاوت ایک انقلابی تحریک کا روپ اختیار کر گئی۔ میرٹھ کا جیل خانہ جس مقام پر تھا اس کو وکٹوریہ پارک کہا جاتا تھا اور اب اسے بھاما شاہ پارک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ میرٹھ کالج کی ملکیت ہے۔ آندولن کرنے سے پہلے انقلابیوں نے پاس میں بنے مندر میں ایک جگہ جمع ہو کر پوجا کی اور حلف لینے کے بعد آگے بڑھے۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعروں سے سارا شہر گونج اٹھا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے گئے، ریلوے لائن پر پہرہ بٹھا دیا گیا جس سے کوئی انگریز نقل و حرکت نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی فوجی پلٹن باہر سے طلب کی جا سکے۔[17]

شاہ مل جاٹ باغپت کا باغی رہنما تھا۔ اس کے بارے میں یہ رپورٹ تھی کہ ”اس نے باغپت پر حملہ کیا اور اسے لوٹا اور دریائے جمنا پر کشتیوں کے پل کو تباہ کر دیا جو میرٹھ اور برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹرز کیمپ کے بیچ رسل و رسائل کا واحد اور سیدھا ذریعہ تھا۔ 9 رجولائی کو باغیوں کا ایک بڑا گروہ بیگم آباد (موجودہ مودی نگر) کو لوٹنے کے بعد سیکری میں جمع ہو گیا اور برطانوی فوجی دستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ڈھولانہ کے باشندوں نے دہلی کے کچھ باغیوں کی امداد سے پولیس افسروں کو نکال دیا اور سرکاری کاغذات اور عمارات کو تباہ کر دیا۔ پرگنہ بڑوت کے لوگ باقاعدہ طور پر رسد فراہم کرتے اور شاہ مل کے توسط سے دلی کے باغیوں کو بھیج دیتے۔ 16 رجولائی کو برطانوی فوجی دستوں کو موضع [illegible] کے باشندوں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے شاہ مل کی اس قسم کی مدد کی تھی اور دہلی کے باغیوں کے لئے اناج کے بھرے ذخیرے فراہم کر رکھے تھے۔ اس اناج کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ محکمہ رسد کی تمام گاڑیاں اس ذخیرے کے صرف ایک قلیل حصہ کو ڈھونے کے لئے ناکافی ثابت ہوئیں۔[18]

اردو کے سب سے پہلے سیاسی اخبار دہلی اردو اخبار کے مجاہد صحافی مولوی محمد باقر نے میرٹھ کے زیرِ عنوان سپاہیوں کی بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ جرم انکار 85 شعراً اس میں سے قید ہوئے کہ یومِ یکشنبہ کو حمیت دینی اور حمیت مذہبی نے جوش کیا اور دفعتاً تمام اہلِ پلٹن رسالہ جو شخص جس حال میں تھا ہتھیار سنبھال کر اول جیل خانہ سے اپنے برادران اسلامی کو چھڑا کے لائے اور معہ پلٹن درپے انگریزوں اور گوروں کے ہوئے اور جہاں ملے تہہ تیغ کیا حتیٰ کہ سب انگریز اور گورے مضطر دمدمہ میگزین میں محصور ہوئے اور غازیان نامی راہی دہلی ہوئے۔ رڑکی سے ایک پلٹن وہاں کے انگریزوں کو مار کر اس طرف آئی تھی کہ میرٹھ میں ان سے گوروں کا سامنا ہوا۔ تائیدِ الٰہی واقبالِ شہنشاہی پلٹن نے ان لوگوں کو پسپا کر کے شکست دے دی اور وہ لوگ پھر اپنے دمدمہ میں گھس گئے اور دو سو گورے مارے گئے۔[19]

میرٹھ کے باغی سپاہیوں کی عقلِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے دریائے جمنا کو پار کیا، ہمارے قدیم ملک کی روایتی دار السلطنت کو برطانوی غلامی کے جوئے سے آزاد کیا اور جلال الدین محمد اکبر کے محروم وارث بہادر شاہ ظفرؔ کے سر پر شہنشاہ ہندوستان کا تاج رکھا۔ اس واقعہ کی انقلابی اہمیت کو ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے۔ چارلس پال نے اس کی کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''میرٹھ کے سپاہیوں نے فی الفور ایک قائد، ایک سکّہ اور ایک نصب العین پالیا ہے۔ غدر کو ایک انقلابی جنگ میں بدل دیا گیا ہے''۔[20]

بغاوت کے بعد کی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ڈبلیو ایچ رسل نے اپنے احساسات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے'' یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ، کسانوں کی بغاوت یکجا ہوگئی بلکہ اجنبی حکومت کا جوا اتار پھینکنے، ہندوستانی والیانِ ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے ایک مذہب کی جنگ، ایک وطن کی جنگ، انتقام کی جنگ، امید کی جنگ تھی۔''[21]

اردو کے ممتاز شاعر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بھی 1857ء کے ہنگامے میں معتوب ہوئے، جاگیریں ضبط ہوئیں اور میرٹھ کے ہنگامے میں سات سال کی سزا ہوئی۔ رہائی کے

بعد میرٹھ کے محلّہ خیر نگر میں حاجی ممتاز علی خاں زبیری کی حویلی میں آپ نے قیام کیا۔ شیفتہ کئی سال تک میرٹھ میں رہے۔ حاجی ممتاز علی غالب کے دوستوں میں تھے اور شیفتہ سے تو غالب کا قلبی تعلق تھا، وہ بہت محبت کرتے تھے، شیفتہ کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اس سے مرزا غالب بھی متفکر رہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا غالب ایک سے زائد مرتبہ شیفتہ سے ملاقات کے لئے میرٹھ آئے۔ [22]

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے اپنی وفاداری انگریز سرکار کے بجائے بہادر شاہ ظفر سے دکھائی اور ایوانِ شاہی میں آداب بجالانے کے لئے کوششیں کیں [23]۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے مزید معلومات فراہم کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کمپنی بہادر نے جو روش اختیار کی تھی ملک گیری کے اعتبار سے اپنی جگہ صحیح تھی مگر آزادی کے اعتبار سے بے چینی کا سبب بنی۔ جاگیروں، ریاستوں، حکومتوں کی ضبطی نے ارباب ثروت و جاگیرداروں میں ایک مخالفت کی لہر پیدا کردی تھی۔ ادھر ہنگامہ جو برپا ہوا تمام جاگیردار بادشاہ دلّی کے ہمنوا بن گئے۔ شیفتہ کو بھی سات برس کی قید فرنگ ہوئی، نواب صدیق حسن خاں شوہر نواب شاہ جہاں بیگم والیٔ بھوپال نے بڑی کوشش کی۔ بعد ان کو رہا کرایا۔ دلّی کا رہنا چھوڑ دیا تھا اپنی جاگیر پر زیادہ قیام رہتا۔ [24]

میرٹھ کے ممتاز صحافی سید جمیل الدین ہجر کے صادق الاخبار نے اپنی شعلہ بیانی سے تحریکِ آزادی کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور دیسی سپاہیوں اور مجاہدینِ آزادی کے جوشِ جہاد میں غیر معمولی شدت پیدا کردی۔ اس جاں باز مدیر کو انگریز دشمن تحریروں کے سبب بغاوت کے الزام میں تین سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی [25]۔ بعد میں انہوں نے میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور میرٹھ سے [illegible] صفحات پر مشتمل ہفت روزہ ''الماس گزٹ'' جاری کیا جس کے سب ایڈیٹر منشی [illegible] تھے۔ بعد ازاں 1872ء میں میرٹھ سے ہی چار صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''نجم ہند'' شائع کیا جو ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ چار روپیہ آٹھ آنہ تھا۔ [26]

کلیات رنج میں جمیل الدین ہجر میرٹھی کے فرزندی ولادت کے تعلق سے ایک

قطعہ تاریخ درج ہے جس سے 1292ھ برآمد ہوتا ہے۔

میرے مشفق و قدرداں کو دیا
خدا نے وہ بیٹا کہ ہے بے عدیل
حمید و سعید و عزیز و رشید
حسین و شریف و نجیب واصل
لبِ ہاتفِ غیب سے اے فصیح
ندا آئے لکھ دے چراغِ جمیل

جمیل الدین ہجر کی ساری زندگی اخبار نویسی میں گزری اور وہ اردو صحافت کے معمار تصور کئے جاتے ہیں۔ جمیل الدین ہجر کے اخبار صادق الاخبار نے 1857ء کے انقلاب کا سور پھونکا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے اور 1882ء مطابق 1299ھ کو میرٹھ میں ان کا انتقال ہوا۔ جارج پیش شور نے تاریخِ وفات کہی۔

لکھی ہے رنج و غم تاریخ ہم نے
(شور)

میرٹھ کے وزیر خاں وزیر 1857ء کے ہنگامے کے دوران باغپت کے کوتوال تھے۔ میرٹھ ضلع کے چوراسی گاؤں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور تشدد پھوٹ پڑا تھا اور اس کی قیادت بجرول گاؤں کا ایک مجاہد شاہ مل جاٹ کر رہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی طرف سے اسے اس علاقہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا تھا۔ اس نے نہ صرف انگریزوں کے ذرائع ابلاغ کو ٹھپ کر دیا تھا بلکہ دلی جانے والی رسد کو بھی ٹھپ کر رکھا تھا[27]۔ وزیر خاں وزیر نے اس لڑائی میں میرٹھ کے باغیوں کا ساتھ دیا اور انہیں بعد میں انگریزوں نے لال قلعہ میں قید کر لیا اور دلی میں ایک ماہ تک قید رہے۔ دلی کے کمشنر بہادر گریٹ ہیڈ کی ذاتی کوششوں سے رہائی نصیب ہوئی لیکن بعد میں میرٹھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ڈنلاپ نے پانچ برس کی قید کا حکم دیا۔ 1881ء میں نوکری ترک کرنے کے بعد وظیفہ تاحیات مقرر ہوا۔[28]

وزیر خاں وزیر پٹیالہ کے نزدیک چھت بنور علاقے کے رہنے والے تھے مگر قصبہ

ہاپوڑ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ 1841ء میں باغپت کے کوتوال مقرر ہوئے اور 1857ء کی تحریکِ آزادی میں شاہ مل جاٹ اور بہادر شاہ ظفر کے درمیان رابطہ کار تھے۔ وزیر خاں وزیر کثیر التصانیف شاعر گزرے ہیں، جن کے تین شعری مجموعوں کے بارے میں اب تک پتہ چل سکا ہے۔ کلیدِ نجات اور نیازِ وزیر مطبع شگوفۂ فیض میرٹھ سے شائع ہوئے تھے جب کہ تیسرے شعری مجموعہ ''رموزِ عاشقاں'' کی قطعہ تاریخ رنج میرٹھی نے کہی ہے جس سے سنہ 1302ھ برآمد ہوتا ہے۔

وزیر خاں وزیر نے کلیدِ نجات کے دیباچہ میں 1857ء کے انقلاب کے جو حالات قلم بند کیے ہیں وہ ہماری آزادی کی لڑائی کی تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں کیونکہ نہ صرف وہ 1857ء کے انقلاب کے عینی شاہد تھے بلکہ دلی کی گرفتاری کے واقعات انہوں نے نہایت دیانت داری سے تحریر فرمائے ہیں۔

رنج میرٹھی نے ''قطعہ تاریخ پنشن یعنی تعین وظیفہ تا حیات ترک ملازمت گورنمنٹ قیصر ہند'' کہا ہے جو کلیدِ نجات میں صفحہ 41 پر درج ہے۔

وہ محمد وزیر خاں صاحب
نیک ذات و صفات نیک چلن
دوست بے ریا و بے کینہ
غم گسار و شریک رنج و محن
خوش معاشوں کے دوست یکتا
بدمعاشوں کی جان کے دشمن
دل سے ناگاہ ملازمی نے کہا
ساعت نیک میں ملی پنشن

1883ء

عبداللطیف نے 1857ء کا تاریخی روزنامچہ لکھا تھا یہ [illegible] شہر سے (جو دہلی سے تیس کوس کے فاصلے پر ہے) ایک تیز آندھی چلی اور اس نے فتنہ

آشوب کا ایک غبار اٹھا اور چشمِ زدن میں دنیا اور دنیا والوں کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ عجیب غبار تھا کہ سرکار انگریزی کی ہندوستانی فوج کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس نے ہندوستان کی زمین تاریک پر بغاوت کا ارادہ نہ کیا ہو اور نئے انداز کی ایسی ہوا چلی کہ حکومتِ انگلشیہ کے لشکر کا کوئی تنفس زیرِ آسمان ایسا نہ تھا جو مخالفت پر آمادہ نہ ہو گیا ہو۔ اولاً اس کے سپاہی جو میرٹھ میں مقیم تھے، کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب نے کارتوس کے بہانے سے اپنے.....ولی نعمت کے احسان کو فراموش کر دیا اور نمک حرامی پر کمر باندھی اور مصمم ارادہ کر کے ظلم و تعدی کا ہاتھ آستین سے نکالا اور قتل و غارت گری کے لئے تیار ہو گئے اور حکام فوج کو ہلاک کیا اور ان کے اہل و عیال کو بھی جہاں تک بس چلا زندہ نہ چھوڑا۔ دو دن تک ''دوسروں'' کو قتل و برباد کرتے رہے۔ گھروں میں آگ لگائی اور خبر رسانی کا راستہ بند کر دیا بعدہٗ دہلی کا عزم کیا۔

16 رمضان 1273ھ مطابق 11 مئی 1857ء یوم دوشنبہ کو انگریزی لشکر جو شاہ جہاں آباد سے مشرق کی جانب ڈھائی کوس کے فاصلے پر ہے، گھوڑوں پر سوار ہو کر آ پہنچے اور 38، 54 اور 74 نمبر کی فوجوں کی سازش سے، جو اس مقام پر متعین تھیں، بے ہودہ ارادہ کیا اور انگریز فوجی اور ملکی حکام میں سے جس کو بھی تیغ پایا تہہ تیغ کر دیا اور پھر شہر کا رخ کیا اور دفتروں میں آگ لگا دی۔ جیل کے دروازے کھول کر قیدیوں کو آزاد کر دیا اور اس دیار کے قرب و جوار کے بدمعاشوں اور دیہاتیوں کی ایک ایک جماعت پر ایسا جنون سوار ہوا کہ اہلِ لشکر کی ہمراہی میں لوٹ مار کے لئے چل دئے اور سرِ راہ لوٹ مار کی اور اس گروہ کے آدمی تیغ و تفنگ لے کر ہر کوچہ اور ہر بازار میں قتل و غارت گری کے لئے درندوں کی طرح چکر لگاتے تھے، دوڑتے تھے اور پکڑ پکڑ کر مارتے تھے۔ مختصر یہ کہ جسے انگریزی لباس میں پاتے تہہ تیغ کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تمام مذاہب کی تعلیم کے لئے سراسر......ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ شہر کے شرفا ان سیاہ کاروں اور بدذاتوں کے شور و شر اور جور و ستم سے پریشان اور مبہوت ہو کر نالہ و فریاد کرنے لگے۔

عبداللطیف کہتے ہیں کہ نمک حرام، بدانجام لشکر نے میرٹھ اور دہلی میں چاروں طرف لڑائی جھگڑا اور کشت و خون کیا اور چنگیز خاں کے آئینِ خون ریزی کو اختیار کیا۔ لوگ

جوق در جوق دہلی میں آ کر قلعہ معلیٰ میں پناہ گزیں ہونے پر ناز کرتے تھے۔ جب لوگ شہر میں داخل ہوئے تو وہ بدنہاد جنگ جو شور و شغب کرتے اور عجب ہنگامہ برپا کرتے تھے"۔[29]

مرزا غالب نے 1857ء کے حالات اور حادثات پر ایک کتاب فارسی زبان میں دستنبو لکھی جس میں غالب انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انہوں نے مصلحت کے قلم سے اسے لکھا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے انگریزوں کے مظالم اور ان کی بے رحمی اور سفاکی کا تاثر ہلکا کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ "باغی" سپاہیوں کے طرزِ عمل کو حاشیہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا:

"16 رمضان 1273ھ مطابق 11 رمئی 1857ء کو علی الصباح یکا یک دلی کی شہر پناہ اور قلعہ کے در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا۔ یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دلی آئے۔ سب کے سب بغاوت پر کمر بستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیماں بھی کر چکے ہوں، دروازے کھول دئے اور حق نمک اور حفاظت شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ یا خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سبک عنان سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھلا ہوا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا اور ان کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی۔ اہل شہر کو، جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومت انگریزی کے سائے میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ جنھیں ر[illegible] سے بے گانہ، تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے نہ شمشیر۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے مر[illegible]۔ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفت ناگہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا۔ اس کے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی انھیں ماتم زدگان میں سے ہے۔ چشم زدن میں صاحب رزیڈنٹ بہادر کے قلعے میں مارے جانے کی خبر آئی۔ معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچے میں گشت لگا رہے ہیں۔ کچھ تو کوئی جدا ایسی نہ تھی جو قتل اندا[illegible]وں سے

خون سے رنگین نہ ہو۔ انگریزوں کے پاس علاوہ دلی میں سوائے اس پہاڑی کے جو شہر میں واقع ہے، اور کچھ باقی نہ رہا۔ چنانچہ اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر زبردست توپیں لگائیں۔ دیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اڑائی تھیں ان کو لے جا کر قلعے میں نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔''[30]

انگریزی سرکار کے مخبر چنی لال نے 12 رمئی سے 20 رمئی 1857ء کے واقعات پر ایک روزنامچہ میں 17 رمئی سے متعلق میرٹھ کے بارے میں لکھا ہے کہ دو ہرکارۂ شاہی میرٹھ سے واپس آئے اور خبر کی قریب ایک ہزار فرنگی مرد اور عورت اور بچہ صدر بازار میں جمع ہو کر رہتے ہیں اور سورج کنڈ پر توپیں چڑھا کر مورچہ قائم کیا ہے اور بیان کیا کہ گوجروں نے میرٹھ اور سلیم پور کے بیچ میں بڑی لوٹ مچا رکھی ہے۔ اس واسطے بادشاہ نے دو کمپنیوں کو پل جمن پر تعین کیا۔

19 رمئی سے متعلق چنی لال لکھتا ہے کہ ''19 رمئی 1857ء روز سرشنبہ بادشاہ دیوانِ عام میں برآمد ہوئے۔ دو سوار میرٹھ سے آئے۔ انہوں نے بیان کیا کہ بریلی اور مرادآباد سے فوج و پیادگان اور سوار مع توپ خانہ اور خزانہ کثیر میرٹھ میں پہنچے۔ ان سے انگریزوں نے فریاد کی کہ میرٹھ کی فوج نے نمک حرامی کر کے اور افسروں کو قتل کر کے دہلی کی طرف راہ لی فوجِ بریلی اور مرادآباد نے انگریزوں کو جواب دیا کہ اس کا عوض تم نے تین سو سفر مینا کی پلٹن کے سپاہی مار کے لے لیا۔ یقین ہے کہ تم ہم سے بھی ایسا ہی سلوک کرو گے۔ یہ سن کر انگریز اپنے مورچہ گاہ میں چلے گئے اور فوج پر گولہ اندازی شروع کی فوج نے بھی مورچہ جما کے گولے مارنے شروع کئے۔ خدا کی قدرت سے ایک گولہ اس سرنگ میں جو فرنگیوں نے کھودی تھی جا پڑا اور سرنگ کے اڑتے ہی تمام فرنگیوں کا مورچہ اڑ گیا اب کوئی فرنگی میرٹھ میں باقی نہیں رہا۔ یہ سن کر فوج اور بادشاہ کو نہایت خوشی حاصل ہوئی۔[31]

میرزا حیرت دہلوی نے ''چراغِ دہلی'' کے عنوان سے اپنی تصنیف میں بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمے میں حکیم احسن اللہ خاں کے بیان کو نقل کیا ہے کہ ''دہلی کی رجمنٹ کے افسروں کی گفتگو سے میں سمجھ گیا تھا کہ دہلی اور میرٹھ کے رسالوں میں کامل اتفاق ہے۔

چٹھیاں اور حکم جو دیگر چھاؤنیوں کی رجمنٹوں کو بھیجے گئے ان میں کبھی ان کے وعدے کا حوالہ نہیں دیا گیا صرف یہ مضمون ہوتا تھا کہ فلاں رجمنٹیں آ گئی ہیں اور کیا تم بھی آؤ گے۔ میری رائے میں باغی دہلی میرٹھ سے محض ان وجوہ سے آئے۔ (1) دہلی میرٹھ سے قریب تھا اور دہلی اور میرٹھ کے رسالہ ہم خیال تھے (2) دہلی میں میگزین وغیرہ بہت تھا (3) دہلی میں شہر پناہ تھی اور محافظت خوب ہو سکتی تھی (4) بادشاہِ دہلی فوج نہ ہونے کی وجہ سے نہتا تھا (5) بادشاہ کے پاس خواہ ہندو خواہ مسلمان رئیس جمع ہونے میں اپنا فخر سمجھیں گے۔

لال قلعہ پر تعینات والنٹیر رجمنٹ کے افسر بآواز بلند کہہ رہے تھے کہ "میرٹھ کے سوار تو آ گئے ہیں پیدل رجمنٹیں پیچھے آ رہی ہیں"۔

حکیم احسن اللہ خاں کا یہ بھی کہنا تھا کہ کچھ باغی افسروں نے بادشاہ سے کہہ کر دہلی کے قرب و جوار کے دو گوجروں کو ایک ڈھول اور ایک لکڑی دلوا دی تھی اور وہ انگریزی کیمپ کی رسد لوٹنے میں شریک ہو گئے تھے۔ اسی طرح سکندرہ، ضلع بلند شہر کے قرب و جوار میں ایک راؤ کو بھی ایک ڈھول اور ایک لکڑی اس غرض کے لئے دی گئی تھی"۔ [32]

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریز اپنے ساتھ صرف سامراجی تسلط ہی نہیں بلکہ مغربی تہذیب، طرزِ زندگی اور معاشی بحران بھی لائے۔ ہندوستان کے لئے عام طور سے اور مسلمانوں کیلئے خاص طور سے یہ ایک نیا حادثہ اور تجربہ تھا۔ انگریز انتقام کی آگ میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تربیت کو ہی نہیں بلکہ ان کے دینی و معاشرتی اور تہذیبی ڈھانچے کو ہی منہدم کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے اجتماعی طور سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریزی حکومت میں ان کی ترقی و کامیابی کا کوئی راستہ نہیں ہو گا جب تک کہ وہ خود اس کی عملی تدبیر نہ کریں۔ اس دور کے قائدین نے مسلمانوں کے مرض کی الگ الگ تشخیص کی اور الگ الگ نسخہ تجویز کیا۔ کسی نے جدید تعلیم کا نسخہ اپنایا، کسی نے قدیم نظامِ تعلیم پر مبنی درسگاہوں کے قیام کو ترجیح دی، کسی نے براہِ راست سماجی و معاشی اصلاح کے منصوبے مرتب کئے تو کسی نے سیاسی و قومی مسائل سے نمٹنے کے لئے انقلابی تحریکیں برپا کیں، کسی نے احیائے خلافت کا ہتھیار

آزمایا تو کسی نے اصلاحِ امت و دعوتِ اسلامی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مستقل بنیادوں پر اقامتِ دین اور احیائے حکومت الاہیہ کا نعرہ بلند کیا۔

یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اس وقت سرسید احمد خاں اور مولانا قاسم نانوتوی دونوں میرٹھ میں موجود تھے۔ سرسید احمد خاں نے اسباب بغاوتِ ہند لکھ کر انگریزوں کی پالیسیوں کو ذمہ دار قرار دیا تو مولانا قاسم نانوتوی نے جہاد کا راستہ چنا۔ مظفر نگر ضلع کے پرگنہ کیرانہ و شاملی میں مولانا قاسم نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، بانی مدرسہ صولتیہ مکّہ معظّمہ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی، مولوی عبدالحکیم اور چودھری عظیم الدین نے شاملی تحصیل پر حملہ کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس جہاد کی قیادت کی اور مسلمانوں، گوجروں اور شیخوں کی بستی میں نقاروں کی آواز پر اعلان ہونے لگا۔

''ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا''

مولانا قاسم نانوتوی اس جہاد میں زخمی بھی ہوئے اور مولانا کیرانوی کو باغی قرار دے دیا گیا اور ان کی زمین و جائیداد کو ضبط کر لیا گیا[33]۔ 30رجون 1857ء کو مولانا رحمت اللہ کیرانوی بغاوت سے متعلق صلاح و مشورہ کرنے کی غرض سے دلی میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے ملے تھے[34]۔ کسی طرح سے وہ مکّہ معظّمہ جانے میں کامیاب ہو گئے جہاں انہوں نے بنگال کی صولت النسأ کے مالی تعاون سے مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔ 75 سال کی عمر میں 24 رمضان 1308ھ میں مدینہ میں وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔[35]

عیسائیوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو انہوں نے اپنا پہلا اور سب سے بڑا دشمن مسلمانوں کو ہی سمجھا کیونکہ مسلمانوں سے ان کی عداوت موروثی تھی۔ صلیبی جنگوں میں ان کی ناکامیاں ایک ایسا زخم ہے جو آج تک انہیں مسلمانوں سے انتقام لینے پر اکساتا رہتا ہے۔ فلسطین، عراق، لیبیا اور افغانستان اس کی تازہ مثالیں ہیں۔

سرسید کے بڑے ماموں نواب وحید الدین خاں جو عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، کسی سپاہی نے عین نماز کی حالت میں ان کو گولی ماردی اور وہ شہید ہو گئے۔ اسی طرح سرسید کے

ماموں زاد بھائی مولانا ہاشم کو بھی انگریزوں نے شہید کر دیا اور سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم اپنی نابینا بہن کے ہمراہ حویلی چھوڑ کر اپنی نوکرانی کی کوٹھڑی میں چھپ گئیں اور گھوڑے کے دانے پر کئی دن تک بسر کی اور پیاس سے بے حال تھیں۔ تبھی سرسید ان کو دلی سے میرٹھ لے آئے اور اس صدمے سے ان کا انتقال ہو گیا اور میرٹھ کے قبرستان میں ان کی تدفین کر دی گئی۔ اس حادثہ کا ذکر سرسید نے سیرتِ فریدیہ میں بہت تفصیل سے کیا ہے اور مولوی الطاف حسین حالی نے حیاتِ جاوید میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے[36]۔ مولوی سمیع اللہ کے سوانح نگار مولوی ذکاء اللہ خاں نے اس واقعہ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔[37]

1857ء کی بغاوت کے نتیجہ میں برطانوی ظلم اور زیادتی سے ہونے والے ذاتی نقصان اور قومی سانحے کی طرف سرسید کے حساس مزاج نے شدید ردِعمل کا ثبوت دیا۔ انہوں نے رسالہ اسباب بغاوتِ ہند میں میرٹھ کی فوج کو سخت سزائیں دینے پر لکھا ہے کہ" میرٹھ میں سپاہ کو بہت سخت سزا دی گئی جس کو ہر ایک عقل مند بہت برا اور ناپسند جانتا ہے۔ اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گزرا بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنے تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اس کے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر روتے تھے وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اس کے صلہ میں جوان کو انعام ملا تھا دیکھتے تھے اور علاوہ اس کے ان کا بے انتہا غرور جوان کے سر میں تھا اور جس کے سبب وہ اپنے تئیں ایک بہت ہی بڑا سمجھتے تھے ان کو زیادہ رنج دیتا تھا۔ پھر سب فوج مقیم میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ یا ہم کو کارتوس کاٹنا پڑے گا یا یہی دن نصیب ہوگا۔ اسی رنج اور غصہ کی حالت میں دسویں مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کی نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملنے کی۔ اس فوج کو کیا چارہ رہا تھا اس حرکت کے بعد بجز اس کے جہاں تک ہو سکے...... پورے کرے۔

میرٹھ کی فوج سے جو حرکت ہوئی تھی اس سے تمام ہندوستانی فوج نے یقین جان لیا تھا کہ اب سرکار کو ہندوستانی فوج کا اعتبار نہ رہا۔ سرکار وقت پا کر سب کو سزا دے گی اور اس سبب سے تمام فوج کو اپنے افسروں کے فعل اور قول کا اعتبار اور اعتماد نہ تھا۔ سب آپس میں کہتے تھے کہ اس وقت تو یہ ایسی باتیں ہیں جب وقت نکل جائے گا تو یہ سب آنکھیں بدل

لیں گے۔.........

ابتدائے غدر میں جب ہنڈن پر فوج کشی کا ارادہ ہوا ہے ہنوز فوج روانہ نہ ہوئی تھی کہ بعضے آدمیوں کی صاف رائے تھی کہ جس وقت دلی پر فوج سے لڑائی شروع ہوئی بلاشبہ تمام ہندوستانی فوج بگڑ جائے گی چنانچہ یہی ہوا۔ سبب اس کا یہی تھا کہ فوج سے لڑائی شروع ہونے کے بعد ممکن نہ تھا کہ باقی فوج سرکار سے مطمئن رہتی۔ وہ ضرور سمجھتی تھی کہ جب ہمارے بھائی بندوں کو ماریں گے تب ہم پر متوجہ ہوں گے اس لئے سب نے فساد پر کمر باندھ لی اور بگڑتے گئے۔ جن کے دل میں کچھ فساد نہ تھا وہ بھی بہ سبب شامل ہوئے فوج کے اس جتھے سے الگ نہ ہو سکے۔ ہندوستانی رعایا جانتی تھی کہ سرکار کے پاس جو کچھ ہے وہ ہندوستانی فوج ہے جب تمام فوج کا بگڑنا مشہور ہو گیا سب نے سر اٹھایا عملداری کا ڈر دلوں سے جاتا رہا اور سب جگہ فساد برپا ہو گیا۔ [38]

سرسید نے اسباب بغاوتِ ہند میں موٹے طور پر پانچ اسباب بیان کئے ہیں (1) تجاویز حکومت سے متعلق رعایا کی غلط فہمی (2) ہندوستانی سیاسی نظام اور یہاں کے عوام کے رسم و رواج کے برخلاف اصول و قانون اور سیاسی نظام کا نفاذ (3) رعایا کے رسم و رواج، عادات و اطوار، ان کی بدحالی اور مصائب سے حکومت کی ناواقفیت (4) فوج میں بد نظمی، بے اطمینانی اور ہندو مسلم اتحاد (5) اچھی حکومت کے لئے حاکم اور رعایا میں اچھے روابط جیسے لازمی امور کا ترک کر دینا اور قانون ساز کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شرکت۔

اس فوجی انقلاب پر قابو پا لینے کے نتیجہ میں انگریزوں کی طرف سے ہندوستانیوں پر جو ظلم و زیادتی ہوئی اس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے سرسید نے خود کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اس صورتِ حال نے ایک نئے سرسید کو جنم دیا[39]۔ اپنے اس نئے تجربے کو سرسید نے تیس سال بعد دسمبر 1889ء میں علی گڑھ میں منعقد ہونے والے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے سالانہ اجلاس میں اس طرح بیان کیا:

''کم بخت زمانہ غدر 1857ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے... نامی نامی خاندان تباہ ہو گئے.... غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف

ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی ملکیت تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا..... میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا...... جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔[40]

بعض انگریز فوجی افسروں نے بھی 1857ء کے واقعات، حالات اور حادثات پر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے لکھا ہے جس کی تاریخی نوعیت آج بھی ہے۔ جے اے بی پامر (J.A.B.Palmer) نے میرٹھ کے انقلاب پر اپنی تصنیف میں 24/اپریل 1857ء کو فوجی پریڈ گراؤنڈ کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"24/اپریل 1857ء کو موسم گرما کے شباب کا زمانہ تھا، لوگوں کے پاس کام کم تھا اور تعطیلات کے مزے لئے جا رہے تھے۔ آرک ڈیل ولسن (Archdale Wilson) اپنے اسٹیشن سے 24/اپریل سے ہی غائب تھا اور اپریل کے اختتام تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔[41] اس کے علاوہ بھی لوگ تھے جو اپنی ڈیوٹی سے غائب تھے۔ واقعہ والے دن 20ویں این آئی میں کیپٹن سے اوپر رینک کا کوئی بڑا افسر موجود نہیں تھا اور ایسی صورت میں میرٹھ میں حالات کا بگڑنا نہایت حشر آمیز تھا، لیکن یہ واقعات اثرات سے خالی نہیں تھے۔ ولسن کی غیر موجودگی میں کاربائنرس کے کرنل جونس (Colonel Jones) اسٹیشن کی کمان سنبھالے ہوئے تھا جس کو ہندوستان کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن جب ولسن واپس آگیا تو جونس چھٹی پر چلا گیا۔ اور کرنل کسٹانس (Colonel Custance) نے رجمنٹ کی کمان سنبھالی[42]۔ اس وقت اسٹیشن پر بوڑھے غریب ہیوٹ (Hewitt) کے علاوہ کوئی سینئر افسر موجود نہیں تھا اور جس سے کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے کارمیچل اسمتھ (Carmichael Smyth) مشورہ ضرور کرتا تھا۔ اور یہی 23/اپریل کو ہوا۔

مارچ کے اختتام پر کارمیچل اسمتھ ایک مینی کے صدر کی حیثیت سے میلہ میں کچھ

اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں ہردوار چلا گیا۔ اسی اثناء میں وہاں ہیضہ پھیل گیا اور اسمتھ نے وقتی طور سے مسوری میں قیام کرنا مناسب سمجھا۔ وہاں اس نے انبالہ میں ابتدائی ہنگاموں کے بارے میں سنا جو رائفل ٹریننگ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ہی اینفلڈ کارتوسوں کے استعمال کے بعد وقوع پذیر ہوئے تھے۔ وہاں اس کی کسی سے ملاقات ہوئی جو سپاہیوں کے ایک گروپ کے ساتھ تھا، اس نے اسمتھ کو بتایا کہ گروپ میں شامل حولدار بہرام پور کے واقعات جو ملک گیر پیمانے پر مشہور ہو چکے تھے، کے حوالے سے کہہ رہے تھے کہ 'میں پچھلے 36 سالوں سے ملازمت میں ہوں اور اب حولدار ہوں لیکن اگر بغاوت ہوتی ہے تو میں بھی بغاوت میں شرکت کروں گا اور پوری فوج بغاوت کرے گی'۔ اس واقعہ کا کارمیچل اسمتھ پر گہرا اثر پڑا۔[43]

13 رابریل کی رات میرٹھ میں ہنگامہ آرائی کا پہلا واقعہ نمودار ہوا۔ جس میں پانچ جھونپڑیاں خاکستر کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک جھونپڑی تیسری گھڑسوار فوج کے ایک سوار کی تھی جس کا نام برجموہن تھا۔ برجموہن کو حوالدار میجر بنا دیا گیا تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پسماندہ ذات سے تعلق کی وجہ سے کارمیچل اسمتھ اسے غیر ضروری طور پر مدد دیا کرتا تھا۔ اس واقعہ کو عمومی طور سے تاریخ دانوں نے نظر انداز کیا ہے جس میں اس منحوس پریڈ سے قبل 13 رابریل کی رات میں برجموہن کے جھونپڑے کو خاک کر دیا گیا تھا۔ اگر چہ اس واقعہ میں بغاوت کا سب سے بڑا ثبوت موجود تھا۔ پھر بھی یہ بہت ہے کہ اس واقعہ کو میرٹھ پولیس کی ڈائری میں ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ بہر حال اس واقعہ کی تفصیلی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ برجموہن کے جھونپڑے کو دو مرتبہ آگ کے حوالے کیا گیا اور تیسری بٹالین میں ایک کشیدگی کا ماحول ضرور تھا جس کا تعلق برجموہن سے تھا[44]۔ وہ انقلابی فوجیوں کی نقل و حرکت کے متعلق ساری اطلاعات انگریز حکام کو دیتا تھا۔

کارمیچل اسمتھ 23 اپریل کو بروز جمعرات واپس میرٹھ پہنچا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق رات میں ایک پالکی میں سوار ہو کر فوجی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ صبح ہونے تک وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا اور ایڈ جوٹینٹ لفٹیننٹ میلوِ لے کلارک (Melville

Clarke) کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کی رہائش گاہ پر آ کر اس سے ملے اور اس کی غیر حاضری میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں پوری تفصیل سے اسے آگاہ کرے یا اسے دکھائے۔ میلو لے نے جو ایک خاص چیز اسے دکھائی وہ پلاٹون مشق کا نظر ثانی شدہ منصوبہ تھا اور اس پر اس نے حکم کی سفارش کی۔ اس کے بعد اسمتھ نے اسی دن 23 اپریل کو تین فیصلے کیے۔

پہلا فیصلہ اس نے یہ کیا کہ اگلے روز یعنی 24 اپریل بروز جمعہ اس نے رجمنٹ کے ان سپاہیوں کی پریڈ کا حکم دیا جن کو کارتوسوں کے استعمال پر اعتراض تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ فوجی ان کارتوسوں کے استعمال کا مظاہرہ کریں اور ان کے سر کو منہ کے بجائے ہاتھوں سے ہی توڑ کر بندوقوں میں ڈالیں۔ مذکورہ تینوں فیصلوں میں یہ پہلا فیصلہ تھا جس سے یہ طے ہو جاتا کہ فوجیوں کا رویہ کیا ہے[45]۔ دوسرا فیصلہ اس نے یہ کیا کہ کمانڈر ان چیف کے ملٹری سکریٹری کرنل کرزن کے نام اس نے ایک خط لکھا جس میں اس نے یہ اطلاع دی کہ میں نے سنا ہے کہ پوری فوج بغاوت پر آمادہ ہے اور اس نے پوری بات من وعن لکھ دی جو اس نے مسوری میں حولدار سے سنی تھی۔ اور درست تو یہی ہے کہ جو کچھ اس نے سنا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ بہر حال، آخر میں اس نے حولدار میجر اور اس کے خاص مخبر برجموہن کو بلا بھیجا۔ جب وہ آ گئے تو اس نے برجموہن کو ایک کارتوس چلانے کے لئے کہا۔ اسمتھ کے مطابق برجموہن نے کہا کہ فوجی مشق میں تبدیلی سے سپاہی خوش ہوں گے۔ یہ شام پانچ سے چھ کے درمیان کی بات ہوگی۔ کیونکہ اس زمانے میں انگریز افسروں کا معمول تھا کہ گرمیوں کے دنوں میں وہ صبح 9 بجے سے شام 5 بجے کے درمیان اندرون خانہ ہی قیام کرتے تھے۔[46]

معاملات کی اس ترتیب میں شک کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ اگر کارمائیکل اسمتھ یہ جانتا تھا کہ پوری بنگال آرمی بغاوت پر آمادہ تھی، جیسا کہ اس نے کرنل کرزن کو خط میں لکھا تھا، تو اس روز پریڈ میں فائرنگ مشق کا حکم دینے سے پہلے اس نے دوبارہ سوچا ہوتا۔ اور اس کو یہ یقین تھا کہ فائرنگ میں کارتوس لوڈ کرنے کا طریقہ بدل دینے سے سب ٹھیک ہو جاتا تو پھر مسوری میں سنی ہوئی ایک بات پر یقین کر کے اس نے کرنل کرزن کو خط میں لکھا

ہوتا کہ پوری بنگال آرمی بغاوت پر آمادہ ہے۔ اپنے دو فیصلوں سے وہ اپنی مستعدی اور حوصلہ کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اطلاع بھیجنے میں دیر نہیں اور ساتھ ہی اپنی سطح پر کارروائی بھی شروع کردی۔ یہ محض اس کی خود پسندی یا بے وقوفی نہیں تھی بلکہ اس میں آنے والی مصیبت کا احساس بھی شامل تھا جس کو وہ چاہتا تھا کہ اسی طرح محسوس کیا جائے اور اس کے سدباب کے لئے کارروائی کی جائے۔ اس کے مشکوک ذہن کا یہ پہلو اس کی شخصیت سے بھی ہم آہنگ ہے جس کی تراش خراش اس حالت میں ہوئی تھی جن کا پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پریڈ کا حکم دیا گیا تھا۔ برجموہن واپس فوجی خیموں کی طرف چلا گیا اور وہاں جاکر اس نے لوگوں سے کہا کہ اس نے نئے کارتوسوں کا استعمال کیا ہے اور سب لوگوں کو کل کی پریڈ میں ان کارتوسوں کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس پر دو مسلمان نائکوں، پیرعلی اور قدرت علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کارتوسوں میں چکنائی کے لئے گائے اور سور کی چربی کا استعمال کیا گیا ہے اور اگر ہم لوگوں نے اس کو استعمال کیا تو سب کا دھرم بھرشٹ ہوجائے گا۔ اس کے بعد تمام لوگوں نے (ہندوؤں نے گنگامیا کی اور مسلمانوں نے قرآن کی قسم کھاکر) عہد کیا کہ وہ ان کارتوسوں کا استعمال نہیں کریں گے جب تک کہ ہر رجمنٹ سے اس سلسلے میں بات نہ ہوجائے۔ اس سلسلے میں جو شواہدات موجود ہیں وہ مشکوک ہیں۔ برجموہن نے نئے کارتوسوں کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن اس نے فتنہ برپا کرنے کے لئے جھوٹ بولا۔ دوسری طرف کارتوسوں کا استعمال نہ کرنے کے سلسلے میں جو قسمیں کھائی گئیں تھیں ان میں جن تین لوگوں کا نام سب سے پہلے آتا ہے وہ ہندو تھے لیکن اس کا بھی الزام ان دو مسلمانوں کے سر منڈھ دیا گیا جنہوں نے پریڈ کے دوران سب سے پہلے کارتوسوں کا استعمال کرنے سے انکار کیا۔ ہاں، اس شب کو رجمنٹ میں فوجیوں کے درمیان انگریزوں کے خلاف تعصب کا احساس پیدا ہوچلا تھا جس کے وافر ثبوت موجود ہیں۔ [47]

24/اپریل کو جمعہ کے دن صبح کو فوجی پریڈ کا حکم دیا گیا اور 90 میں سے 85 جوانوں نے جب کارتوس کے استعمال کرنے کو منع کردیا تو فوجی افسر کرنل اسمتھ نے اسے ڈسپلن شکنی

سے تعبیر کیا تبھی اس نے حولدار میجر بخش علی کو کاربائن سے گولی چلانے کا حکم دیا جو اس نے پورا کیا۔ اس طرح 90 میں سے صرف پانچ فوجیوں نے کرنل اسمتھ کے حکم کی تعمیل کی جن میں تین مسلمان اور دو ہندو تھے۔ اس پر بقیہ ہندوستانی فوجیوں کے خلاف سنیچر کے دن 25/اپریل کو کورٹ آف انکوائری شروع ہوئی جو سات کمیشنڈ افسروں پر مشتمل تھی جن میں چار بیسویں این آئی اور تین ایل سی کے افسران تھے۔

ان افسران میں کپتان میکڈونلڈ (Macdonald) اور کپتان ارل (Earle) کے علاوہ ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل میجر ہیریئیٹ (Harriott) بھی موجود تھے۔ کارمیچل اسمتھ نے سب سے پہلے اپنی گواہی دیتے ہوئے ان ہندوستانی فوجیوں کو سخت سزا دینے کی اپیل کی۔ کورٹ آف انکوائری اس نتیجہ پر پہونچی کہ ہندوستانی فوجیوں میں افواہیں پھیلائی گئی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ باغی ہوگئے ہیں اور اس کی جانچ کو شملہ میں موجود جج ایڈووکیٹ جنرل کیتھ ینگ (Keith Young) کے پاس سفارش کے ساتھ بھیجا گیا کہ ان کا کورٹ مارشل کیا جائے جسے کیتھ ینگ (Keith Young) نے منظور کرلیا۔[48]

کورٹ مارشل کی خبر سے ہندوستانی فوجیوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے افسروں کے بنگلوں کو نذر آتش کرنا شروع کردیا۔ فوجی گوداموں کو آگ لگائی گئی اور 7/مئی کو رات بھر گولیاں داغی گئیں۔ کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کے خالی بنگلہ کو بھی نہیں بخشا اور پرانے ہسپتال کو بھی آگ کے حوالے کردیا گیا۔[49]

کرنل کیتھ ینگ (Keith Young) کی اہلیہ نے سرجنری ڈبلیو نورمن کے ساتھ ''دلی 1857ء'' کے عنوان سے ایک ڈائری لکھی ہے جس میں انہوں نے اپنے شوہر کی ڈائری میں لکھے خطوط شامل کئے ہیں۔ 27/اپریل کو شملہ میں کرنل کیتھ ینگ (Keith Young) لکھتے ہیں کہ جس طرح حولدار (برج موہن) کی جھوٹی چالاکی اس وباغی سپاہیوں کی ایک منظم سازش قرار دیتے ہوئے اس طرح کی وارداتوں کو روکنے سے سخت احکامات دئے تھے۔[50]

کرنل کیتھ ینگ (Keith Young) 2/مئی کو کرنل ایچ بی ہینڈرسن (Colonel

(H.B.Henderson کو لندن لکھے اپنے خط میں کہتا ہے کہ میرٹھ کے ان فوجیوں کی نافرمانی پر ان کا جنرل کورٹ مارشل کر دیا گیا ہے اور بعض کو سولی پر بھی چڑھا دیا گیا ہے۔ یہ فوجی اگر اس طرح کی حرکت دوبارہ کرتے ہیں تو میرٹھ میں تعینات تمام فوجی افسران کو احکامات دے دیئے گئے ہیں کہ ان کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں اور ان کی سرکشی کو ہر حالت میں روکا جائے۔ میرے بزرگ سر چارلس نیپئیر (Sir Charles Napier) موقعہ پر موجود رہیں گے تاکہ کسی بھی ہنگامی حالات کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے[51]۔

مسز کیتھ ینگ 14 رمئی کو شملہ سے اپنی بہن کو لندن میں میرٹھ کی صورتِ حال سے مطلع کرتی ہیں کہ انبالہ سے کپتان برنارڈ گھوڑے پر سوار ہو کر شملہ میں جنرل اینسن (Ansan)، کمانڈر ان چیف کو اطلاع دینے آئے ہیں کہ میرٹھ سے دلی کے لئے ٹیلیگرام کی لائن 10 رمئی سے کاٹ دی گئی اور میرٹھ شہر پوری طرح سے باغیوں کے نرغے میں ہے اور کشتیوں کے پل پر بھی باغیوں کا قبضہ ہے اور کئی افسروں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔

اسی خط میں وہ آگے لکھتی ہیں کہ میرٹھ کے کپتان واٹر فیلڈ کا ایک دستی پیغام لے کر ایک قاصد آیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے ہیں اور فوجی اسٹیشن چاروں طرف سے جل رہا ہے، کئی فوجی ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ ان باغیوں نے یوروپین فوج کے چرچ سے لوٹنے پر حملہ کر دیا ہے اور دلی کی طرف کوچ کر گئے ہیں۔ میرٹھ سے کوئی اطلاع نہیں موصول ہو رہی ہے یہ بہت ہی بری علامت ہے۔

گزشتہ شب دلی سے ایک خبر آئی تھی کہ دلی کی فوج نے بھی بغاوت کر دی ہے۔ دریا کے کنارے پر واقع میگزین پر قبضہ کر لیا ہے اور دلی کے بادشاہ کا اقتدار بحال کر دیا ہے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ دلی کے جج فریزر (Fraser)، کپتان ڈگلس، مسٹر برس فورڈ، کرنل ریلے اور دوسرے افسروں کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے؟ یہ اسی خاتون کے خطوط ہیں جو آگ اور خون کا کھیل خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

اسی خط میں وہ یہ بھی لکھتی ہیں کہ ہندوستان کے فوجیوں اور عوام میں یہ احساس پیدا کر دیا گیا ہے کہ ہماری سرکار انہیں عیسائی بنا رہی ہے اور کارتوس میں چربی کا استعمال کیا

جا رہا ہے۔ کئی ماہ قبل میری آیا نے مجھے بتایا کہ اسے پتہ چلا کہ کھانے کے آٹے میں سؤر اور چربی کی ہڈیوں کا برادہ ملایا جا رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کیا بکواس ہے کس نے تم سے کہا؟ تب اس نے جواب دیا کہ "یہ حقیقت ہے" بازار کے تمام لوگوں نے اسے بتایا۔ تب مجھے لگا کہ شاید بنیا آٹے میں کچھ ملا کر اپنا وزن بڑھا رہا ہو۔ وہ لکھتی ہیں کہ میرٹھ میں جنرل ہیوٹ کا مکان بھی جلا دیا گیا ہے اور میرٹھ کے کمشنر مسٹر گریتھیڈ (Greathed) اپنے نوکر کے مکان کے ایک کونے میں چھپ کر اپنی جان بچا رہے ہیں۔[52]

اس تاریخی واقعہ کو ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اپنی طویل رزمیہ نظم اٹھارہ سو ستاون میں پیش کیا ہے۔[53]

مئی اگارہ کے دن کو تھا میرٹھ میں سناٹا
سورج نے ہر راہ پہ دیکھا انگریزوں کا لاشا
چار دشاؤں میں میرٹھ کے تھا بس خون خرابہ
چوہے کی بل تک میں گھسنے کو انگریز نے سوچا

ساری اکڑفوں نکل گئی ایک دن میں بس انگریزوں کی
سنو بھائیو! سنو بھائیو! کتھا سنو ستاون کی

میرٹھ کے ان حالات اور واقعات کی اطلاع دینے کے لئے میرٹھ پولیس کا ایک پیغام لے کر ایک سوار دلی انگریز حکام کے پاس بھیجا گیا۔ معین الدین خاں نے لکھا ہے کہ فریزر (Fraser) کو رات میں میرٹھ سے ایک چوکیدار نے ایک خط دینے کی کوشش کی مگر وہ کھانا کھانے کے بعد اپنی کرسی پر سو گئے تھے۔ ان کے ملازم نے جب انہیں خط دینے کی کوشش کی تو وہ اس پر بری طرح ناراض ہوئے اور خط کو بغیر پڑھے اپنی جیب میں ڈال لیا۔[54] سائمن فریزر دلی کے کمشنر اور بہادر شاہ کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے اور کشمیری گیٹ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع لڈلو کاسل میں رہتے تھے۔

9 مئی کی رات کو کرنل کارمائیکل اسمتھ (Carmcheal Smyth) نے اپنے

بنگلہ پر رات کو کھانے کی دعوت کا اہتمام کر رکھا جس میں سرجن میجر کرسٹی (Christie) اور مویشی ڈاکٹر فلپس (Philips) کو مدعو کر رکھا تھا کہ شام کو چھ بجے کے قریب جب عشائیہ ختم ہو رہا تھا تبھی میجر جے ایف ہیریئٹ (Harriott) ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل آئے اور انہوں نے خبر دی کہ میکڈانلڈ نے انہیں بتایا کہ بازار میں لوگ جمع ہو رہے ہیں اور بیسویں فوجی چھاؤنی لائنس میں بھی لوگ قطار بنائے موجود ہیں اور شام چھ بجے کے بعد گولیاں داغنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ تبھی اسمتھ نے ہیریئٹ کو اپنی بگھی میں سوار کرا کر رخصت کر دیا۔ میجر کرسٹی اور فلپس دوسری بگھی میں سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔

میجر فیئر لی (Fairlie) اور لیفٹیننٹ میل وِلے کلارک (Malville-Clarke) کو کارمیچائل اسمتھ نے طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ گھوڑے تیار رکھیں اور گشت شروع کر دیں۔ اسمتھ ایک ہفتہ کے لئے فیلڈ آفیسر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے جمعدار مان سنگھ اور حولدار میجر برجموہن کی طلبی کی اور بتایا کہ انہیں اطلاع ملی کہ رجمنٹ کے حالات خراب ہو رہے ہیں۔ گف نے بتایا کہ ایک کرنل کا قتل بھی کر دیا گیا ہے اور وہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تبھی جمعدار مان سنگھ اور حولدار میجر برجموہن رجمنٹ پہونچے اور ان سپاہیوں کو سخت وارننگ دی۔ جب وہ وہاں پہونچے تبھی ان انقلابی سپاہیوں نے یوروپین اسٹاف کے خلاف گھیرابندی شروع کر دی اور اسمتھ اپنے دو اردلیوں کے ہمراہ کمشنر مسٹر گریتھیڈ (Greathed) کے بنگلہ پر پہونچے جہاں تعینات عملے نے بنگلہ کا دروازہ بند کر دیا مگر وہ کسی طرح بنگلہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ کمشنر اپنی رہائش گاہ پر موجود نہیں ہیں جب کہ حقیقت میں وہ اس رات کو اپنے بنگلہ میں اپنے ملازم کے مکان کی چھت کے اوپر چھپے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسٹر اسمتھ ہیوٹ (Hewitt) کے بنگلہ پر آئے مگر انہوں نے پایا کہ وہ بھی اپنے مکان پر نہیں ہیں۔ تب وہ بریگیڈیئر کمپاؤنڈ پہونچے جہاں گولیاں چل رہی تھیں[56]۔ کمانڈر ان چیف سر پیٹرک گرانٹ (Patrick Grant) نے میرٹھ ڈویژن کے کمانڈر جنرل ہیوٹ کو اپنے فرائض میں لاپرواہی برتنے اور اعلیٰ حکام کو صحیح صورت حال سے مطلع نہ کرنے کے الزام

میں 28 رجون 1857ء کو سبکدوش کر دیا۔ ان پر میدانِ جنگ میں دیر سے آنے اور ڈھیلے ڈھالے ڈھنگ سے باغیوں کا پیچھا کرنے کا الزام بھی عائد کیا گیا تھا۔

جب کچھ افسر پریڈ گراؤنڈ پہونچے اور ان انقلابی فوجیوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تبھی ان فوجیوں کا ایک گروہ انگریز افسروں کے بنگلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ فوجی انقلابیوں کا ایک گروہ جن کی تعداد تقریباً پچاس تھی پریڈ گراؤنڈ سے نئی جیل کی طرف کوچ کر گئے تاکہ اپنے ساتھیوں کو رہا کرایا جا سکے[57]۔ کچھ لوگ سورج کنڈ کی طرف چل دئے۔ کچھ جوان کمبوہ گیٹ سے داخل ہو کر شاہ پیر گیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ شہریوں سے اپیل کر رہے تھے کہ مذہب کی اس جنگ میں ان کے ساتھ شامل ہوں۔ میجر ولیمس نے اپنی گواہی میں کہا کہ 10 رمئی کی رات کو نہ صرف شہر کے شہری بلکہ قرب وجوار اور دور دراز کے گاؤں کے لوگ بھی بھیڑ میں شامل ہو گئے جس میں گوجروں کی تعداد حیرت انگیز تھی[58]۔

میرٹھ میں اس رات ہتھیار بند دیہی لوگوں کی بڑی تعداد میں موجودگی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کی شہر میں موجودگی کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ یہ آزادی کے لئے ایک منظم تحریک تھی جس میں فوجیوں کے ساتھ میرٹھ کے عوام برابر شریک تھے اور بعض خفیہ نمائندے ضرور تھے جو ہر دم کے واقعات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے[59]۔

میرٹھ کی پرانی جیل سے 720 قیدی رہا کرائے گئے وہ تقریباً سات بجے کے بعد ہی چھڑائے گئے۔ جیسا کہ جیل داروغہ محمد اشرف بیگ نے کہا کہ تقریباً سات بجے تین چار سو فوجیوں نے آکر اس سے چابیاں مانگیں جو اس نے نہیں دیں اور وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ بھی بغیر کسی مزاحمت کے جیل سے چلے گئے۔ فوجیوں نے ایک دروازے اور بیرک کو توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرا لیا[60]۔

1857ء نے اس ہنگامہ کو ایک قومی تحریک کا روپ دینے [illegible] گاؤں گاؤں میں پنچایتیں ہونے لگیں۔ موضع کاٹھہ جو سہارنپور اور دلی شاہدرہ پر باغپت سے دلی جانے والی سڑک پر واقع ہے، وہاں سب سے پہلے ہزار آدمیوں کی ایک پنچایت ہوئی[61]۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد معین الحق کاٹھوی کا اسی گاؤں سے تعلق تھا۔ اس علاقہ [illegible]

انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے کیونکہ ان کا لگان دوگنا کر دیا گیا تھا۔ پورے اتر پردیش میں کاشت کے لئے مشہور یہ علاقہ اقتصادی بحران کا شکار ہو رہا تھا اور انہوں نے موقعہ ملتے ہی ساہوکاروں کو لوٹا، مال خانوں پر قبضہ کیا اور تحصیلوں کو راکھ کر دیا اور انگریزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کر دیا، اس علاقہ کے سب سے بڑے رئیس فرانس کوئن فراسو پر شب خون مارا۔ شامل جاٹ نے فراسو کو یرغمال بنالیا۔[62]

بابا شاہ مل مرد آہن اور تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی ٹولی میں چھ ہزار سے زائد انقلابی تھے جن میں بلواڑی کے پنڈت دوڑے رام، بڑکہ گاؤں کے بہت سے راجپوت، نراج پور کے اچل سنگھ گوجر، بلوج پوری کے بلوچی نبی بخش وغیرہ سبھی ذات برادری کے لوگ اس کی قیادت میں انگریزی راج کے خلاف جمنا کے کنارے سہارنپور سے دلی تک گوجر، جاٹ، برہمن، مسلمان، تیاگی وغیرہ انگریزی راج کے صفائے کے لئے مستعد تھے، ان میں تھوڑے بہت غدار بھی تھے۔[63]

اچاریہ دیپانکر نے اپنی ہندی کتاب ''سواد ھینتا آندولن اور میرٹھ'' میں لکھا ہے کہ کرم علی جو مسلمان راجپوت رانگڑ تھا اس نے گوڑانا کے بیہا نام کے جنگل میں جہاں چکنی مٹی ہونے کی وجہ سے شاہ مل دلدل میں پھنس گیا تھا، اس پر پیچھے سے حملہ کر کے شاہ مل کا سر قلم کر دیا اور اپنے انگریز آقاؤں کو اس کا سر دکھایا جس کے بدلے اسے باغپت کی نوابی اور کئی گاؤں بطور انعام دئے گئے۔[64]

اچاریہ دیپانکر نے کرم علی کو شاہ مل کا قاتل قرار دے کر میرٹھ کی تاریخ کو مسخ کیا ہے اور انہوں نے اس طرح کی الزام تراشی کر کے اس کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا اور 1967ء کے اسمبلی انتخابات میں نواب کرم علی کے پوتے نواب شوکت حمید کو شکست دی۔ نواب شوکت حمید کے صاحبزادے نواب کوکب حمید کو بھی باغپت کے اسمبلی انتخابات میں اس بے بنیاد اور گمراہ کن پروپیگنڈے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ اس اسمبلی حلقے سے لگاتار کامیاب ہوتے رہے ہیں اور اتر پردیش میں کابینہ وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857ء کے ہنگامے میں انگریزوں کا ساتھ دینے پر باغپت کے تحصیلدار کرم علی کو

نواب کے خطاب سے نوازا گیا جس کی شہادت جارج پیش شور کی ڈائری میں ملتی ہے، جو اس کتاب کا موضوع ہے۔

اس کے علاوہ 20 رجولائی بروز پیر کو مسٹر کیتھ ینگ دلی کینٹونمینٹ کیمپ سے اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ کیا تمہارے پاس میرٹھ فوج کے اس دستے کی سرگرمیوں سے متعلق کچھ اطلاعات ہیں جس کو شملہ میں حالیہ فساد کے لیڈر شاہ مل اور اس جیسے لوگوں کی سرکوبی کے لئے تعینات کیا گیا تھا؟ ہمارے پاس کوئی تحریری رپورٹ نہیں آئی ہے لیکن ایک مقامی سوار کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تقریباً چھ سو باغی اور ان کے لیڈر مارے جا چکے ہیں اور شاہ مل کے بیٹے کو قیدی بنالیا گیا ہے لیکن اس کی تفصیلات میرٹھ سے براہ راست شملہ پہنچ رہی ہیں۔[65]

کارل مارکس نے اس انقلاب کے سیاسی و اقتصادی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا ہے کہ انگریزوں کو پختہ یقین تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کا دارومدار ہندوستان کی فوج تھی لیکن انہیں یہ زبردست جھٹکے کے ساتھ احساس ہوا کہ فوج ہی ان کے لئے اصل خطرہ کی وجہ بنی لیکن یہ سپاہی تو ایک وسیلہ تھے۔ اصل میں ہندوستان کے عوام اس سیاسی اور اقتصادی استحصال کے خلاف میدان عمل میں اٹھ کھڑے ہوئے[66]۔ اس طرح جو آگ سید احمد شہید نے مسلمانوں کے دلوں میں جگائی تھی وہ 1857ء میں ایک بار پھر شعلہ بن گئی۔ ہندوستان کا کوئی حساس دل ایسا نہ رہا جس میں آزادی کی موجیں نہ اٹھتی ہوں۔

1857ء کے علماء مجاہدین میں سب سے معتبر نام مولوی احمد اللہ شاہ کا ہے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو ہزاروں ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آگرہ کی تقریر میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' کے مصنف مولانا طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ مولانا کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ پولیس نے ایک موقع پر مجسٹریٹ کے حکم کے باوجود انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔[67]

مولانا احمد اللہ شاہ نے 1856ء میں میرٹھ جا کر انقلاب کے لئے ماحول سازی کا کام بھی انجام دیا تھا۔ دلی، میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ وغیرہ کی تمام فوجی چھاؤنیوں میں مولانا احمد اللہ شاہ کے فقیری لباس میں موجود رہنے کے ثبوت ملتے ہیں۔[68]

راجہ مرسان سے ملنے کے لئے مولانا احمد اللہ شاہ علی گڑھ تشریف لائے ۔ انہوں نے سرائے رتن لال میں قیام کیا اور راجہ کی طرف سے انہیں نذر کے طور پر ڈھائی سو روپیہ نقد، ایک قیمتی گھوڑا اور دو شکاری کتے بھی دیئے گئے [69]۔ مولانا کے نام کا سکہ جاری ہو چکا تھا اور وہ ہزاروں مریدین کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ قادریہ سلسلہ سے تھے۔ لندن ٹائمز کے نمائندے مسٹر رسل نے 1857ء کو مسلمانوں کی جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کبھی کبھی مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انہیں سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا، ان پر سور کی چربی ملی جاتی تھی اور پھر ان کے جسم جلا دیئے جاتے تھے [70]۔ فوجی گواہیوں میں اس بات کے ثبوت بھی ملے تھے کہ ماہ اپریل میں نانا دھوندو پنت عظیم اللہ کے ہمراہ میرٹھ آئے تھے اور انہوں نے دیسی فوجیوں کو سیاسی آزادی کی تبلیغ کی تھی۔

علمائے وقت انگریزوں کے خلاف فتوے جاری کر رہے تھے اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دے رہے تھے جس کے نتیجے میں مسلمان ''یا خدا ہمیں بھی پھانسی دلا'' کی دعا مانگتے [71]۔ اسی طرح دلی کے پنڈت بھی انگریزوں سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے پوتھی پتر سے حساب لگا کر لڑنے کے لئے شبھ مہورت نکال کر تلنگوں کو بتلاتے تھے اور ان کو یقین دلاتے تھے کہ اگر لڑتے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ پنڈتوں نے تلنگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ انگریزی حکومت پھر دوبارہ قائم نہیں ہوگی۔ ان ایام میں ایک عجیب تماشہ چاندنی چوک اور دوسرے بازاروں میں دیکھنے کو آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھوں میں پوتھیاں ہوتی تھیں اور وہ ہندوؤں کے دھرم شاستر کے حکم سناتے تھے۔ ان فتووں اور پنڈتوں کے دھرم شاستروں کے احکام نے ہندو اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں انگریزوں کے خلاف اور آگ لگا دی تھی۔ [72]

صوبیدار سیتارام نے یہ بڑی دل چسپ بات لکھی تھی کہ ''ہمارے پنڈتوں نے یہ تو بتا دیا تھا کہ 1857ء میں کمپنی کی حکومت ختم ہو جائے گی کیونکہ پہلی بڑی لڑائی (پلاسی کی جنگ) کو اس وقت سو سال پورے ہو چکے ہوں گے لیکن انہوں نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی جگہ پر ایک دوسری انگریزی حکومت قائم ہوگی جو اپنی پیش رو حکومت سے جابر تر اور دشوار تر ہوگی۔'' [73]

جے اے بی پامر اپنی کتاب میرٹھ میں سرکشی 1857ء میں 11 رمئی کو انگریزوں کی ہلاکت سے متعلق لکھتا ہے:

''میرٹھ میں غدر کے موقعہ پر ہونے والی اموات کی کوئی فہرست موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی ایسی خاص بات ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ جو رپورٹس اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں بھی شاید ہی کسی فوجی یا غیر کمیشنڈ افسر کا نام موجود ہے۔ زیادہ تر ہلاک ہونے والے یوروپین یا یوریشین تھے جو معمولی عہدوں پر تعینات تھے اور جن کی شناخت کسی بھی طرح مسلم الثبوت نہیں تھی۔ جنرل ہیوٹ نے کل اموات کی تعداد تقریباً 40 بتائی ہے جبکہ ریورینڈ ٹی سی اسمتھ نے لکھا ہے کہ ''اس نے اور اس کے دوست مسٹر روٹن نے 31 لوگوں کو دفن کیا تھا جبکہ اموات کی تعداد اس کے علاوہ اور بھی تھی''[74]۔ 8 کمیشنڈ افسران مارے گئے تھے، کرنل فنس، کیپٹین ٹیلر، میکڈانلڈ اور ہینڈرسن، لفٹیننٹ پیٹل، کارنیٹ میکنیب اور مویشی معالج فلپس اور ڈاسنس۔ ان کے علاوہ ریٹائرڈ سرجن اسمتھ تھے اور انسپکٹر آف ایجوکیشن ٹریگیئر۔ اس کے بعد تین افسران کی بیویاں مسز میکڈانلڈ، مسز چیمبرس اور مسز ڈاسنس، ان کے علاوہ مسز کورٹنی اور دو بچے جن کو ملا کر یہ تعداد چھ ہو جاتی ہے۔

ماتحت عملہ اور پنشن یافتہ لوگوں میں سرجنٹ لا اور دو بچے، مارکو اور ہیوگس کو ملا کر تعداد مزید پانچ ہوتی ہے[75]۔ ایلفورڈ کے بنگلے پر یا اس کے قریب پانچ رائفل مین مارے گئے۔ تین آرٹیلری مین جو بازار میں مارے گئے ان کے نام کونولی، کیرکس اور نیلسن تھے[76]۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نام اور ان کی موت کے وقت کے حالات کے واقعات مستند ہیں۔ ان کو شامل کر کے کل اموات کی تعداد ہوتی ہے 29 جو ریورینڈ ٹی سی اسمتھ کی بتائی ہوئی تعداد کے قریب ہے۔

لیکن عدالتی بیانات سے کئی اموات کے شواہد ملتے ہیں جو معلوم اموات کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں لیکن جو معلوم تعداد میں قابل ذکر اضافہ کرتے ہیں۔ قدیم جیل کے قریب مختلف بیانات کے مطابق 8 سے 15 لاشیں تھیں جن میں مسز میکڈانلڈ کی لاش بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کو جوڑنے کے بعد بھی کل تعداد میں دس سے زیادہ کا اضافہ نہیں ہوتا[77]۔

ساٹھویں بٹالین کے ایک سرجنٹ کے مطابق دیسی سپاہیوں کی ٹکڑیوں سے شمال کی طرف 4 لاشیں پڑی تھیں۔ ممکن ہے یہ لاشیں ایکفورڈ کے بنگلے پر تعینات رائفل مین کی ہوں لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ لاشیں اس کے رجیمنٹ کے لوگوں کی تھیں۔ ایک اور شخص جو غالباً یوریشین تھا، کے بیان کے مطابق ایک علیحدہ عورت، اور ایک جگہ دو عورتوں اور ایک مرد کی لاشیں شہر کے قریب جنوبی علاقے میں پڑی ہوئی تھیں۔ دو اور لوگوں کے بیان کے مطابق ایک جگہ دو عورتوں اور ایک مرد کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ خیال اغلب ہے کہ بازار میں اور اس کے آس پاس کچھ اور یوروپین فوجیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور غیر فوجی لوگ جو مارے گئے ان کا تو کسی بیان میں ذکر ہی نہیں ہے۔ بیانات سے ثابت اور ان اموات کو ملا کر جن کا ذکر بیانات میں موجود نہیں ہے مزید 20 سے 29 مستند اموات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کل تعداد 49 ہوتی ہے۔ ہیوٹ کے مطابق کل اموات کی تعداد 40 کے بجائے 50 ہونا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔''

میرٹھ کے واقعہ کے بارے میں ایک ضروری سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعات کسی منصوبہ بند تیاری کا نتیجہ تھے یا محض حالات کے پیش نظر اچانک ایسی صورتحال بن گئی اور یہ واقعات رونما ہوئے۔ لیکن ان واقعات کو کسی بھی طرح سے دیکھا جائے، اس سوال میں کئی ایسے ابہام ہیں جن کی صراحت ضروری ہے۔ درحقیقت سوالات تین ہیں۔ کیا 10 مئی کو پیش آنے والے واقعات محض اتفاقیہ تھے؟ یا کئی دنوں یا ہفتوں پہلے میرٹھ میں ہی ان کی منصوبہ بندی کی گئی تھی؟ یا اس کی منصوبہ بندی بہت پہلے کی گئی تھی اور اس واقعے کے پیچھے وسیع مقاصد کارفرما تھے؟ ان تینوں سوالوں میں سے دوسرا سوال سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور اس پر پہلے غور کیا جانا چاہئے کیونکہ یہی سوال اس جواب کا حامل ہے جو بہت واضح ہے اور اسی سوال کا بقیہ دو سوالوں سے بھی گہرا ربط ہے۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا میرٹھ کے واقعات 10 مئی سے کچھ روز یا کچھ ہفتے قبل کی کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھے؟

اس موضوع پر اعلیٰ انگریز افسران کا ماننا ہے کہ میرٹھ میں متعین رجیمنٹ اور کم از کم

میرٹھ میں جو بڑی تعداد میں سپاہی تعینات تھے ان کے درمیان اس کی پہلے سے کوئی تیاری نہیں تھی۔ حالانکہ سپاہیوں کی بڑی تعداد کے سلسلے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اگر اس بڑی تعداد کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے کسی پوشیدہ منصوبے کا علم ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ رائس ہومس (Rice Holmes) کا بھی یہی خیال ہے اور اس کے بارے میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ **میرٹھ ڈی پوزیشنس** میں شواہد کی روشنی میں اس بات کو خاطر میں رکھنا چاہئے اور نہایت باریکی سے اس کا تجزیہ کیا جانا چاہئے۔ اس کے بعد مسٹر ایس این سین نے زیادہ قطعیت کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی ہے۔ رائس ہومس اور مسٹر ایس این سین، دونوں نے میرٹھ واقعات کے سلسلے میں کھانا پکانے والے لڑکے کے واقعہ کو تسلیم کیا ہے حالانکہ اس واقعہ کی کوئی سند موجود نہیں ہے، نیز چرچ پریڈ کے واقعے پر بھی انہوں نے یقین کا اظہار کیا ہے جس سے دیسی سپاہیوں کی ٹکڑیوں میں فساد پیدا ہوا حالانکہ دستیاب حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی واقعہ ان دو حقائق کی تطبیق نہیں کرتا جن سے یہ مستند ہو جاتا ہے کہ میرٹھ کا واقعہ منصوبہ بند تھا اور میرٹھ کے فوجیوں کے درمیان اس کی پہلے سے تیاری کی گئی تھی۔

ان دو حقائق میں سے ایک وہ رپورٹ ہے جو 9 مئی کی شام میں گف (Gough) کے پاس لائی گئی تھی اور دوسری حقیقت یہ کہ 10 مئی کو صبح 9 بجے سے شام 4 بجے کے درمیان میرٹھ اور دلی کے درمیان ٹیلی گراف لائن کاٹ دی گئی تھی۔ گف کے پاس لائی گئی رپورٹ میں خاص طور سے یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ انفینٹری پرچم بغاوت بلند کرے گی اور کیولری اس کے نقش قدم پر ہوگی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ وہی دو ہی کورٹ مارشل کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف تھی۔ یہ ممکن ہے کہ واقعات کی ترتیب بدل جاتی لیکن میرٹھ میں اس روز جو ہوا وہ اس رپورٹ کے عین مطابق ہوا جو گف کے پاس پہنچی تھی۔[78] اسے محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دو واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے اور اس کے بعد بڑے پیمانے پر فتنہ وفساد برپا ہوا۔ اور پھر اس تناظر میں ٹیلی گراف کے تار کاٹنے کی رپورٹ بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں رہ

جاتا کہ 9 مئی تک تمام منصوبے مکمل کر لئے گئے تھے اور 10 مئی کو صبح ہی تار کاٹنے کا کام انجام دے دیا گیا جو اس منصوبے کا ہی ایک حصہ تھا۔ [79]

اس کے بعد یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے جس کا تعلق پہلے سوال سے ہے کہ بازار میں برپا ہونے والا فساد بھی اتفاقیہ نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ 10 مئی کی شام میں فساد شروع ہوتا اور فوراً ہی بازار میں بھی بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ ایسا ہونے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت درکار ہوتا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بازار میں بھگدڑ کرانا منصوبے کا پہلا عمل تھا۔ اس میں بھی بہرام پور والا طریقۂ کار ہی اپنایا گیا۔ فائرنگ پریڈ نے سب سے پہلے کارتوسوں سے متعلق وسوسہ پیدا کیا۔ اس کے بعد اس پورے فساد کے منتظمین کی جانب سے کچھ لوگوں نے معینہ وقت پر شر انگیزی شروع کر دی۔ بہرام پور کی طرح ہی اس تحریک کے قائد بھی پردے میں تھے لیکن ان کے ہی ایماء پر بازار میں جمع غیر جانبدار فوجیوں کو آلۂ کار بنانے کی غرض سے تحریک کے نمائندوں نے فتنہ پھیلانا شروع کر دیا۔

منصوبے کی تفصیلات اور واقعات کی ترتیب میں نمایاں ہنر مندی سے بھی اس نتیجے کو تقویت ملتی ہے۔ مغرب سے ذرا پہلے ٹھیک 5 بجے شام میں ہنگامہ شروع کیا گیا۔ جیسا کہ میجر ہیریٹ نے دلی میں سابق بادشاہ کے مقدمے کی سماعت کے دوران بیان دیا، انقلابی جانتے تھے یوروپین فوجیوں کو جمع کرنے اور موقعہ واردات پر متعین کرنے کے لئے کم سے کم ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ درکار تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق انہوں نے 5 بجے ہنگامہ شروع کر دیا کیونکہ ان کے اندازے کے مطابق یوروپین فوجی اندھیرا ہوتے ہی موقعہ پر پہنچ جاتے۔ اندھیرا ہونے سے چاند کے نکلنے تک تقریباً دو گھنٹے کا وقفہ درکار تھا۔ اتنا وقت دیسی سپاہیوں کے خیموں میں ہنگامہ برپا کرنے کے لئے کافی تھا جب تک انگریزی فوجیں موقعہ پر نہیں پہنچتیں۔ اندھیرا ہونے کے بعد انگریزی فوج کے پہنچنے سے قبل دیسی فوجیوں کو راہ فرار اختیار کرنے کا بھرپور موقعہ فراہم ہوتا۔ اس کے علاوہ صدر بازار میں فساد شروع کر دینے سے انگریزی فوجیوں کو موقعہ واردات تک پہنچنے میں کافی دقت ہوتی کیونکہ موقعہ واردات تک پہنچنے کا واحد راستہ صدر بازار ہو کر ہی گذرتا تھا، نیز صدر بازار کے علاقے میں

فساد جاری ہونے کی وجہ سے یوروپین فوجیوں کے لئے بھی یہ راستی مخدوش ہوتا اور وہ خود بھی فساد کو رفع کرنے میں لگ جاتے۔ اس طرح بازار کی بھیڑ کو اپنے منصوبے کے مطابق استعمال کر کے دیسی فوجیوں کا مقصد انگریزی فوج کو گمراہ کرنا اور اپنا کام کر کے اندھیرے میں بآسانی راہ فرار اختیار کر لینا تھا۔ وقت کی صحیح منصوبہ بندی اور انگریز فوج کی نقل و حرکت میں رخنہ اندازی کے لئے بازار میں فساد برپا کرنے سے ان کا مقصد کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا جبکہ دیسی فوجیوں کی پوری ٹکڑی تیار تھی اور انگریز فوج کے پہنچنے سے پہلے اندھیرا کا فائدہ اٹھا کر انہیں وہاں سے راہ فرار اختیار کر لینا تھا۔ ان کا منصوبہ غالباً قدیم جیل سے قیدیوں کو رہا کرا کے پورا ہو گیا جو باغیوں کے گروہ میں تازہ دم اضافہ کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔

اس پورے تناظر میں یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ 9 مئی کو فائرنگ پریڈ کے خاتمے کے بعد سے 10 مئی کو صبح تار کاٹنے تک اتنی ہنرمندی سے تیار کیا گیا منصوبہ چند لوگوں کے کسی معمولی گروہ کا کارنامہ تھا۔ یہ یقیناً ایسا منصوبہ تھا جس کی تیاری کافی دنوں پہلے کی گئی تھی۔ اس منصوبے کی تیاری غالباً فائرنگ پریڈ سے تقریباً 15 دنوں پہلے سے کی گئی تھی اور یہ کورٹ مارشل کے اس واقعہ کا شاخسانہ تھا جس کا اندازہ پہلے سے کیا جا سکتا تھا۔

جن امور پر دھیان نہیں دیا گیا وہ کورٹ مارشل کا فیصلہ، اس کی تعمیل اور سزا یافتہ فوجیوں کی قید کا صحیح بندوبست تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سواروں کی آزادی کا معاملہ منصوبے کا اصل مقصد نہیں تھا۔ جیسا کہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے، بغاوت کا مرکز یہ معاملہ نہیں تھا۔ اس کی منصوبہ بندی بالکل مختلف خطوط پر کی گئی تھی جس میں سواروں کو آزاد کرانا کہیں بھی شامل نہیں تھا۔ سواروں کی آزادی ایک ثانوی بات تھی جس کو آخری لمحوں میں تیسری بٹالین کے فوجیوں کے ذریعہ منصوبے میں شامل کیا گیا تھا جس کو کسی بھی بنیاد پر بغاوت کی کمان نہیں دی جا سکتی تھی۔ درحقیقت یہ 20ویں بٹالین تھی جس کو بغاوت کی کمان دی جانی تھی اور جس نے بالآخر کمان اپنے ہاتھوں میں لی۔

حالانکہ بغاوت کے منتظمین اور قائدین کی شناخت نہیں ہو سکی لیکن واقعات سے

ثابت ہوتا ہے کہ اس پورے ہنگامے کے پس پشت کچھ لوگ ضرور تھے۔ ان میں سے کچھ یا سارے لوگ فوجیوں کے اس جتھے سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے جس کو فائرنگ پریڈ کے بعد کورٹ مارشل کے ذریعہ قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ لوگ منتظمین میں شامل ہوتے تو وہ قید میں ہونے کی وجہ سے اس منصوبے کو اتنی مہارت کے ساتھ انجام نہیں دے پاتے۔ دو لوگ پیر علی اور قدرت علی نے سب سے پہلے کارتوسوں کا استعمال کرنے سے انکار کیا تھا جن کو سرغنہ تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن وہ بغاوت کے اصل قائدین کے ہاتھوں براہ راست آلۂ کار ضرور تھے۔ دلی کو دوبارہ مرکز بنانے کے فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بغاوت کے انتظامی سطح پر کچھ گروپس کام کر رہے تھے جن کا پہلا مقصد یہی تھا۔ دیسی فوجیوں کی برطرفی کا کام جاری تھا اس کے باوجود ریتھانی کے اجتماع میں عمومی طور سے اس مقصد کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی رائے پوری بھیڑ کو بہکانے میں کامیاب رہی۔

میرٹھ سے حاصل شواہد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میرٹھ اور دلی چھاؤنیوں یا ان چھاؤنیوں اور دلی دربار کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت تھی۔ لیکن دلی کو مرکز بنانے کا فیصلہ ان کے درمیان کسی نہ کسی قسم کی مفاہمت کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے کیونکہ بغاوت میں اتنے خدشات و خطرات تھے کہ اس سلسلے میں دلی چھاؤنی کے فوجیوں کو اعتماد میں لئے بغیر یا وہاں کے دیسی فوجیوں کی رضامندی کے بغیر اتنا بڑا کام کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ دلی اور میرٹھ کے درمیان ٹیلی گراف کے تار کاٹنے کا واقعہ بھی دلی کو اس پوری جدوجہد کا مقصد بنانے اور میرٹھ ہنگامے کی خبر کو قبل از وقت دلی میں بیٹھے افسروں تک پہنچنے سے روکنا تھا۔ ان دونوں مقامات کا قریب ہونا اور میرٹھ کورٹ مارشل کے واقعہ پر دلی کے دیسی فوجی افسروں کے ساتھ صلاح و مشورہ کی آسانی سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ بغاوت کا اصل مقصد دلی حکومت کا قیام تھا۔

جہاں تک آخری سوال کے جواب کا تعلق ہے کہ اس بغاوت کی تیاری کافی پہلے سے کی گئی تھی اور اس کے وسیع مقاصد تھے۔ اس سوال کے لئے ضروری ہے واقعات کی اس ترتیب کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے جس کی ابتدا میرٹھ سے ہوئی تھی۔ بارکپور اور بہرام پور کے

واقعات جو شروع ہو کر اچانک بند ہو گئے دراصل اس بڑے ہنگامے کا شاخسانہ تھے جن کی ابتدا منگل پانڈے کے معاملے سے ہوئی اور پھر یکے بعد دیگرے پریسیڈینسی ڈویژن جو حکومت کے دارالخلافہ سے بالکل قریب تھا، میں وقوع پذیر ہوئے۔ لیکن یہ ساری شورشیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد یہ سوچنا فطری تھا کہ بغاوت کی سازشیں ان مقامات سے شروع کی جائیں جو اندرون ملک ہونے کی وجہ سے دارالخلافہ سے دور تھیں، جہاں دیسی فوجیوں کی کثیر تعداد تھی اور وہ اپنے آبائی مکانات سے بھی پاس تھے۔ لیکن اس قسم کا منصوبہ مختلف رجمینٹس کو اعتماد میں لئے بغیر نہیں بنایا جا سکتا تھا ورنہ بھید کھلنے پر بغاوت کا اصل یا نظر ثانی شدہ منصوبہ افشاں ہو جاتا جس کے قائد پردۂ گمنامی میں ہی رہنا چاہتے تھے۔ فوجی خیمے سے باہر چپاتی تحریک یا وائر فیلڈ اسپنگ وہیل کے واقعات اس وسیع منصوبے کا حصہ تھے جن کا مقصد فوجی چھاؤنیوں میں خلفشار پیدا کر کے پریسیڈینسی ڈویژن میں ایک بڑی بغاوت کو ہوا دینا تھا۔ ان واقعات کی تاریخیں اور ترتیب اس مفروضے کے بالکل عین مطابق معلوم ہوتی ہیں کہ فروری مارچ تک ایک بڑی بغاوت وقوع پذیر ہوتی۔ لیکن یہ منصوبہ ناکام ثابت ہوا اور غالباً خلاف توقع مئی میں میرٹھ میں وہ ہو گیا جس کا اندازہ برٹش انڈیا کی فوج کو نہیں تھا یا وہ اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے ملکہ وکٹوریا کی حکومت قائم ہو جائے۔ 1857ء تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار رہا جبکہ انگلینڈ کی پارلیامنٹ کمپنی کے اقتدار کو پسند نہیں کرتی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح کمپنی کے اقتدار کو ختم کر کے براہ راست پارلیامنٹ کے اقتدار کو ہندوستان میں قائم کرے۔ 1857ء کے انقلاب کے واقعات اور حادثات کے نتیجے میں ہندوستان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ختم ہو گیا اور اس ملک پر برٹش پارلیامنٹ اور تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ اس طرح 134 دن بعد پھر سے دلی میں انگریزوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔

1857ء کے واقعہ کی بہت سی یادگاریں آج تک محفوظ ہیں۔ میرٹھ سے جنگ کے میدان میں شہید اسمارک بنایا گیا۔ یہ سنگ مرمر کا تقریباً سو فٹ اونچا ایک ستون ہے جہاں ہر سال دس مئی کو مجاہدین آزادی اور شہر کے عوام جمع ہو کر شہیدوں کو خراج عقیدت پیش

کرتے ہیں۔ میرٹھ شہر کا خونیں پل اس بات کا ثبوت مانا جاتا ہے جہاں سینکڑوں جہادیوں کو ایک ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ میرٹھ کے کینٹ ایریا میں سینٹ جونس مسیحی قبرستان میں دس مئی کو ہلاک ہونے والے انگریزوں کی قبریں ہیں جن پر آج بھی کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اسی قبرستان کے نزدیک ہی سینٹ جونس چرچ ہے جہاں 10 رمئی کو انقلابی فوجیوں نے انگریز افسران کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس چرچ پر گولیوں کے نشانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میرٹھ کینٹ میں ہی کالی پلٹن کی پوجا کے لئے شیو مندر ہے جس کے پجاری نے کالی پلٹن کو بغاوت کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اسی علاقہ میں گرو تیغ بہادر اسکول کے سامنے کرنل اسمتھ کا بنگلہ آج بھی موجود ہے۔

میرٹھ کے دیہی علاقوں میں کھیکڑا قصبہ کے موضع ہرچندر پور میں گادلیب فرانسس کوئن فراسو کی حویلی اس عظیم تاریخی واقعہ کی خاموش گواہ ہے۔ دلی کے بہت سے انگریز اعلیٰ حکام نے اپنی جان بچا کر اس حویلی میں پناہ لی تھی۔ بجرول گاؤں میں شاہ مل جاٹ کا قدآور مجسمہ ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ میرٹھ باغپت روڈ پر واقع موضع پانچلی میں مجاہدین آزادی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ایک پتھر نصب ہے۔ موضع کو میھڑا میں جن انقلابیوں کو پھانسی دی گئی ان کے ساتھ ہی ان کی بیویاں بھی ستی ہوگئیں۔ ستی کے اس مندر میں گاؤں کی عورتیں ان کی پوجا کرتی ہیں۔ میرٹھ میں عبداللہ پور کی جیل کے پاس ایک قدیم برگد کا درخت ہے جس کا استعمال محبّ وطن کو پھانسی پر لٹکائے جانے کے لئے کیا گیا تھا۔

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ بعض جنگیں شہادت کے لئے بھی لڑی جاتی تھیں۔ 1857ء کی جنگ شہادت کی جنگ تھی جس نے 90 سال بعد ہندوستان کو سامراجی تسلط سے آزاد کرایا اور اس ملک کے عوام کو آزاد فضا میں جینے کا موقع فراہم کیا۔ میرٹھ کی اس مقدس سرزمین کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اوم پرکاش آزاد نے لکھا ہے کہ:

یہ ستاون کے ویروں کی زمیں عزت کے قابل ہے
یہ آزادی کی دولت کی امیں عزت کے قابل ہے
جو رہ رہ کر ابھرتی ہے سدا ذہن مورخ میں

یہ میرٹھ ارضِ دلنشیں عزت کے قابل ہے

24 ر اپریل 1857ء کو تیسری گھڑ سوار فوج کے پچاسی فوجی جنہوں نے میرٹھ میں چربی لگے کارتوسوں کا استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

1۔ حولدار ماتا دین
2۔ شیخ پیر علی (نائک)
3۔ امیر قدرت علی (نائک)
4۔ شیخ حسین الدین (نائک)
5۔ شیخ سرور محمد (نائک)
6۔ شیتل سنگھ
7۔ جہانگیر خاں
8۔ میر موسم علی
9۔ علی نور خاں
10۔ میر حسین بخش
11۔ متھرا سنگھ
12۔ نارائن سنگھ
13۔ لال سنگھ
14۔ شیودان سنگھ
15۔ شیخ حسین بخش
16۔ صاحب داد خاں
17۔ بشن سنگھ
18۔ بلدیو سنگھ
19۔ شیخ نندو
20۔ نواب خاں
21۔ شیخ رمضان علی
22۔ علی محمد خاں
23۔ مکھن سنگھ
24۔ درگا سنگھ (اول)
25۔ نصر اللہ خاں
26۔ محراب خاں
27۔ درگا سنگھ (دوئم)
28۔ نبی بخش خاں
29۔ جرکھان سنگھ (اول)
30۔ بھوَو خاں
31۔ جرکھان سنگھ (دوئم)
32۔ عبداللہ خاں
33۔ ایسن خاں (اول)
34۔ زبردست خاں
35۔ مرتضیٰ خاں
36۔ برزور خاں
37۔ عظیم اللہ خاں (اول)
38۔ عظیم اللہ خاں (دوئم)
39۔ کالے خاں
40۔ شیخ عبداللہ

41۔ سالار بخش خاں
42۔ شیخ رفعت علی
43۔ دوارکا سنگھ
44۔ کالکا سنگھ
45۔ رگھوبیر سنگھ
46۔ بلدیو سنگھ
47۔ درشن سنگھ
48۔ امداد حسین
49۔ پیر خاں (اول)
50۔ موتی سنگھ
51۔ شیخ آرام علی
52۔ ہیرا سنگھ
53۔ سیوا سنگھ
54۔ مراد پیر خاں
55۔ شیخ آرام علی
56۔ کاشی سنگھ
57۔ اشرف علی خاں
58۔ قادر داد خاں
59۔ شیخ رستم
60۔ بھگوان سنگھ
61۔ میر امداد علی
62۔ شیو بخت سنگھ
63۔ لکشمی سنگھ
64۔ شیخ امام بخش
65۔ عثمان خاں
66۔ دروائے سنگھ
67۔ متمول علی خاں
68۔ شیخ غیاث خاں
69۔ شیخ امیر علی
70۔ عبدالشہاب خاں
71۔ رام سہائے سنگھ
72۔ پناہ علی خاں
73۔ لکشمی دوبے
74۔ رام سرن سنگھ
75۔ شیخ خواجہ علی
76۔ شیو سنگھ
77۔ شیتل سنگھ
78۔ موہن سنگھ
79۔ ولایت علی خاں
80۔ شیخ محمد خاں
81۔ اندر سنگھ
82۔ فتح خاں
83۔ میکو سنگھ
84۔ شیخ قاسم علی
85۔ رام چرن سنگھ

حوالہ جات

1- Lord F. S. Roberts, Forty One Years in India, p. 241

2- انقلاب 1857ء، پی سی جوشی

3- Meerut Depositions, nos. 12, 13 and 14

4- Smyth's account, p. 91 and his evidence at the court of Enquiry, Forrest, Selections, Vol. I, pp. 230

5- میرٹھ تاریخ و خدمات، ص 27، نور احمد میرٹھی، تذکرہ شعرائے میرٹھ، ادارۂ فکرِ نو، کراچی

6- ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

7- Meerut Depositions, nos. 33-6

8- The Mutiny Outbreak at Meerut in 1857, J.A.B. Palmer, p. 70, Cambridge University Press

9- ظہیر دہلوی، داستانِ غدر

10- رومال سنگھ، مجلہ سوتنترتا سنگرام سینک، ص 23، موانہ ضلع میرٹھ

11- میرٹھ، تاریخ و خدمات

12- حیاتِ اسماعیل، مصنف محمد اسلم سیفی، ص 10-9، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

13- قلق محمد غلام مولیٰ، ص 789، تذکرہ شعرائے میرٹھ

14- ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، مفتی انتظام اللہ شہابی، ص 221

15- تحریک آزادی اور ہندوستانی مسلمان، محمد احمد صدیقی، ص 528، داستان اٹھارہ سو ستاون، مرتبہ فاروق ارگلی، زید بک ڈپو لمیٹڈ، نئی دہلی

16- Narrative of Events, No. 406, F. Wlliams, 15

November 1858

17- ٹھاکر پرساد سنگھ، سوتنتر تا سنگرام کے سینک، محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش، جلد 16

18- سن ستاون کا کرانتی ویر ''بابا شاہ مل جاٹ'' ڈاکٹر مہیندر شرما

19- مولوی محمد باقر، دہلی اردو اخبار، 17 رمئی 1857ء

20- Indian Mutiny, Charles Paul

21- My Diary in India 1856-59, W. H. Russel

22- تذکرۂ شعرائے میرٹھ، مرتبہ نور میرٹھی، ادارۂ فکر نو، کراچی، ص 41

23- عبداللطیف کا روزنامچہ، مرتبہ خلیق احمد نظامی

24- ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی، ص 58، دینی بک ڈپو، اردو بازار، دلی

25- تذکرہ ماہ وسال از مالک رام

26- اختر شہنشاہی (سوانح عمری اخبارات)، سید محمد اشرف نقوی، مطبع اختر پریس، لکھنؤ، 1888ء

27- سن ستاون کا کرانتی ویر، بابا شاہ مل جاٹ، ڈاکٹر مہیندر نارائن شرما، دی جرنل آف دی میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ المنائی، مئی 2007

28- رنج میرٹھی، راحت ابرار، ص 110، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

29- 1857ء کا تاریخی روزنامچہ، عبداللطیف، ص 122-120، مرتبہ خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دلی، 1954

30- غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

31- چراغ دہلی، میرزا حیرت دہلوی، ص 77-76، اردو اکادمی، دہلی

32- ایضاً ص 238، 240

33- ورمار گھونندن اور ارون گپتا، ہندوستان کی تحریک آزادی میں مظفر نگر کا حصہ، ص 50، سوتنتر تا سنگرام سنگٹھن، مظفر نگر، 1997

34- ماہنامہ ذکر و فکر، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، شمارہ ستمبر - اکتوبر 1988

35- ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی، ص 30

36- حیات جاوید، الطاف حسین حالی

37- سوانح عمری مولوی سمیع اللہ از مولوی ذکاء اللہ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

38- اسباب بغاوت ہند، سر سید احمد، ص 53-52، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

39- علی گڑھ تحریک: سماجی اور سیاسی مطالعہ، مظہر حسین، ص 137، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی

40- مقالاتِ سرسید، اسماعیل پانی پتی، ص 185-184، مجلس ترقی ادب، لاہور

41- J. A. B. Palmer, The Mutiny Outbreak at Meerut in 1857

42- Forrest. Selections, Voil. I, p. 228

43- Smyth's Account, pp. I

44- Brijmohan's Caste. Kaye. Sepoy War. Vol. II,p. 47

45- Smyth's account. p 91 and his evidence at the Court of Inquiries

46- ایضاً

47- J. A. B. Palmer. The Mutiny Outbreak at Meerut in 1857, p. 60

48- ایضاً

49- Delhi Gazette, 19 May 1857

50- Delhi 1857. Sir Henry & Mrs. Keith Young

51- ایضاً

52- ایضاً

53- اٹھارہ سو ستاون، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، تاریخی تناظر کا آئینہ، پروفیسر سید [illegible]

حسین رضوی، نیادور، لکھنؤ، ص193، اپریل- مئی 2007ء

-54 خدنگِ نظر: 1857 کا ایک تاریخی روزنامچہ، ص23، وقار ناصری، نیادور، لکھنؤ، اپریل- مئی 2007

-55 Mutiny Outbreak at Meerut in 1857 by J. A.B.Palmer

-56 Smyth's Account, p. 94

-57 Meerut Depositions, Nos. 56 & 73

-58 Memorandum on the Mutiny and OUtbreak by G. W. Williams

-59 Narrative No. 434, p. 64-8

-60 Depositions, No. 22-9

-61 جرمن نسل کا ایک اردو شاعر: پیارے لال شاکر، ص74، سالنامہ ادبی دنیا، لاہور

-62 وقائع حیرت افزاء (مخطوطہ)، جارج پیش شور

-63 آچاریہ دیپانکر، سوادھینتا آندولن اور میرٹھ، ص142-141، جن مت پرکاشن، میرٹھ، 1993ء

-64 ایضاً، ص123

-65 دہلی 1857ء، سرہینری ڈبلیو نارمن اینڈ مسز کیتھ ینگ، ص142-141

-66 رجنی پرمانند، آج کا بھارت، 1977، ص110-107

-67 مسلمانوں کا روشن مستقبل: مولانا طفیل احمد منگلوری، مکتبہ الحق، ممبئی

-68 Mallesan, The Indian Mutiny of 1857, p. 24

-69 سید ظہیر حسین جعفری، احمد اللہ شاہ، ص245، Rethinking 1857

-70 Sir William Russel, My Diary in India in the Year 1856-59

-71 Aligarh: In Historical Perspective by Mamoon Ahmad Khan, S. S. Hall Review, 1984

-72 مولانا امداد صابری، 1857ء کے مجاہد شعراء، ص150

-73 سپاہی سے صوبیدار تک سیتارام، ص165، لاہور 1873ء

-74 جنرل ہیوٹ کا ٹیلی گرام، 18 مئی 1857ء، فوریسٹ سلیکشن، جلد اول، ص225

-75 Meerut Depositions, nos. 46, 48 and 52

-76 ایضاً، nos. 44 and 45

-77 The European Troops Movements, p. 75, Palmer

-78 General Sir H. Gough, Old Memories, pp. 21-22

-79 Col. E. Vibart, The Sepoy Mutiny (1898), pp. 255-6

باب دوئم

حالاتِ زندگی: جارج پیش شور

فرنگی شاعروں اور ادیبوں میں جارج پیش شور (George Puech Shor 1823-1894) کو ایک اہم ادبی مقام حاصل ہے۔ وہ پہلا ایسا غیر ملکی شاعر ہے جو نہ صرف 1857ء کے انقلاب کا عینی شاہد ہے بلکہ ایک فرنگی ہونے کے ناطے وہ ان المناک مظالم و مسائل کا شکار بھی ہوا اور اس کی غیر مطبوعہ تصنیف ''وقائع حیرت افزا'' غدر 1857ء کے انقلاب آفریں مگر روح فرسا واقعات سے پُر ہے۔ اس ڈائری سے اس عظیم واقعہ کے بعض تاریخی حقائق اور نا قابلِ فراموش واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور انقلاب 1857ء کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقعہ پر نئی نئی معلومات منظرِ عام پر آئی ہیں۔ شور کا یہ مخطوطہ 1857ء کے انقلاب کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

جارج پیش شور کے جدِ امجد فرانس سے آکر ریاست گوالیار کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ کا نام کیپٹن پیش تھا۔ علی گڑھ ضلع بہت عرصہ تک گوالیار ریاست کے قبضہ میں رہا اور علی گڑھ قلعہ کا جنرل پیروں (Perron) بھی فرانسیسی تھا۔ خود جارج کے نانا فرانسیس کوئن فراسو بھی اس قلعہ کے قلعہ دار رہ چکے تھے جو بعد میں الور فوج کے کپتان بھی رہے [1] مسلم یونیورسٹی کا موجودہ سلیمان ہال اس کی رہائش گاہ تھی اور یہ علاقہ آج بھی صاحب باغ کہلاتا ہے۔ جارج پیش شور یکم دسمبر 1823ء کو علی گڑھ شہر کے محلہ ماموں بھانجہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد جان پیش (John Puech) رہتے تھے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ علی گڑھ میں قلعہ دار کی حیثیت سے انہوں نے اپنی بیٹی کی

شادی کے لئے جان پیش کو پسند کیا ہو۔

جان پیش نے اپنے بیٹے جارج پیش کی تربیت میں ابتداً سے ہی اس بات کا خیال رکھا کہ وہ نہ صرف مشرقی علوم حاصل کریں بلکہ مشرقی تہذیب وتمدن کی بہترین روایات کو بھی اپنائیں۔ چنانچہ انہوں نے نو برس کی عمر میں ہی اردو اور فارسی کی معیاری تعلیم حاصل کر لی تھی۔ بعد میں میرٹھ میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا غالب کے ناقد مرزا رحیم بیگ رحیم سے مزید تعلیم حاصل کی۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے بڑے بھائی مولوی عبدالحکیم جوش (بانی فیض عام کالج، میرٹھ) اور غلام محی الدین عشق و مبتلا کے پوتے حافظ امداد حسین ظہور و عرفانی ان کے ہم جماعت تھے۔ عربی کی تعلیم میرٹھ کے ممتاز عالم قاضی رشید الدین سے حاصل کی تھی۔ شاعری میں مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی سے مشورہ کیا اور پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے صاحبزادے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لی اور بعد میں خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔[2]

1857ء کے انقلاب سے پہلے جارج پیش کے والد جان پیش علی گڑھ میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ یہاں ان کا نیل اور سود کا کاروبار تھا۔ 1857ء کی بغاوت جب ناکام ہوگئی تو ان کے والد کو بھی حکومت برطانیہ کی طرف سے علی گڑھ کے رام گھاٹ روڈ اور اترولی علاقہ میں بہت سی زمین و جائیداد ملی جس پر جارج پیش شور نے ایک قطعہ تاریخ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ جان پیش کا انتقال 1872ء کو علی گڑھ میں ہو گیا اور تصویر محل کے نزدیک کیتھی قبرستان میں ان کی تدفین کی گئی۔ جارج پیش شور کے دیرینہ رفیق اور شاگرد غالب حکیم محمد فصیح الدین رنج میرٹھی نے تاریخ وفات کہی

یعنی از ظلم بر آمد دو الف

گفت ور جان پیش ظلم رئیس

1872ء

جارج پیش کی والدہ کا نام میڈالا ون تھا جو اٹھارہویں صدی کے پہلے اندھ جرمن شاعر اور ادیب کا دلیب فرانسیس کون فراسو (Gotlieb Frances Kome Frasoo

(1861-1777 کی صاحبزادی تھیں۔ فراسونہ صرف اردو اور فارسی کے ممتاز شاعر تھے بلکہ انہیں ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ یہودی جرمن تھے اور 15/ مارچ 1777ء میں کٹرہ بیگم اندرون چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔[3] ان کے والد کا نام جان آگسٹائن گادلیب کوئن تھا جو فوج میں ملازم تھے اور فراسو کی والدہ مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ لاسٹ مغل کے مصنف اور ممتاز تاریخ داں ولیم ڈیل رمپل نے انہیں گورا مغل کہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فراسو نے اتنا ادبی کام کیا ہے کہ اگر اس کو اونٹ پر لادا جائے تو بھی کم ہے۔[4]
گادلیب فرانسیس کوئن فراسو 1857ء کے انقلاب کا بھی عینی شاہد تھا اور اس نے اس غدر کی فارسی زبان میں منظوم تاریخ ''فتح نامہ انگریز'' کے عنوان سے لکھی تھی جو شائع نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دوسرا خدا بخش لائبریری پٹنہ اور تیسرا اس کتاب کے مصنف کے پاس محفوظ ہے۔ مولانا امداد صابری نے اپنی تصنیف ''1857ء کے مجاہد شعرا'' میں فراسو کا نام کپتان الیکزنڈر بیدرلی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔[5]

فرانسیسی شاعر جارج پیش شوؔر (George Puech Shor) نے اپنے نانا فراسو کے حالات قلم بند کئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ شوؔر نے اپنے نانا کے انتقال کے بعد موضع ہر چندر پور تحصیل پرگنہ کھیکڑا ضلع باغپت میں فراسو کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس پر ایک تختی نصب تھی۔ شور نے لکھا ہے کہ فراسو کا انتقال ہیضہ اور پیچش کے مرض میں 1861ء میں چوراسی سال کی عمر میں ہوا۔ باغپت سے صرف چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہر چندر پور کی اس حویلی کے باہر فراسو کی پختہ قبر کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ البتہ مقبرہ اور قبر کا کتبہ اب موجود نہیں ہے۔ اس عظیم فارسی شاعر کی قبر پر گوبر کے اُپلے پڑے ہوئے تھے جو دیہاتوں میں ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ قبر کے نزدیک ایک بہت پرانا کھرنی کا درخت بھی موجود ہے۔ حویلی کا صدر دروازہ آثارِ قدیمہ کا کوئی کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ آج کل اس حویلی پر گاؤں والے قابض ہیں۔ ولیم ڈیل رمپل نے اپنی انگریزی کتاب 'لاسٹ مغل' میں فراسو کی تدفین سردھنہ کی بیگم سمرو کے مسیحی قبرستان میں درج کی ہے[6] جو صحیح نہیں ہے۔

فرانسس کوئن فراسو کی تربیت اس کے خالو لوئی بالتھر رین ہارٹ عرف نواب ظفر یاب خاں صاحب کی نگرانی میں میرٹھ ضلع کے سردھنہ میں ہوئی جو خود بھی جرمن تھا۔ ظفر یاب مسلمان رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اس لئے اس کے مصاحبین میں اردو اور فارسی شعراَ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ فراسو نے شاہ نصیر سے تلمذ حاصل کیا تھا اس کی تائید فراسو کے ایک شعر سے ہوتی ہے۔

تجھ کو ہے شاید فیضِ اصلاحِ نصیر
شاعرانِ شہر میں تو اہلِ دیواں بن گیا

فراسو کے متعلق شیفتہ کا بیان ہے کہ بیگم سمرو کے یہاں ذخیرے کے متعلق خدمات پر ملازم تھے[7] جبکہ بیگم سمرو کے درباری مورخ منشی گوکل چند انہیں بیگم سمرو سے متعلق اپنی تصنیف زیبِ تواریخ میں فراسو کو بیگم سمرو کا درباری شاعر لکھتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ فراسو کی حیثیت سردھنہ کے حکمراں خاندان کے فرد کی تھی[8] فراسو کے نواسے جارج پیش شور اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔

ہمارے تھے نانا وہاں ہم نشیں
تھے رشتے میں ڈائس کے بالیقیں
تھا اس کا بھی رتبہ بہت سا بڑا
ریاست میں عامل کیا ان کو تھا
عنایات بیگم تھی ان پہ سوا
بڑا رعب ان کا ریاست میں تھا

فراسو کا قلم ہر صنف سخن پر رواں تھا۔ اس نے لاتعداد قصیدے بھی سب اور مثنویاں بھی لکھیں۔ غزل اور ہزل پر بھی اسے دسترس حاصل تھی۔

رام بابو سکسینہ اپنی مشہور تصنیف ''یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین'' میں کلیات فراسو کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کا ایک مخطوطہ لائبریری رام پور کے کتب خانے میں موجود تھا۔ دیوان کا نام ''گنبدِ گیتی نما'' تھا۔ اس میں فراسو کا اردو، فارسی اور

ہندی کا تمام کلام محفوظ ہے۔ ''شمس الذکاٗ'' کے نام سے فراسو نے ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جس میں اس کے خالو ظفریاب کے درباری شعرأ کے سوانح اور انتخاب کلام دیا ہوا ہے جس کے پایۂ تکمیل کو پہونچنے کا سنہ 1792ء ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے فراسو کے کلام کا انتخاب اپنے رسالے اردوئے معلیٰ کے ضمیمے میں شائع کیا تھا۔ اسی کا انتخاب رام بابو سکسینہ نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں دیا ہے۔ پیارے لال شاکر میرٹھی نے 1939ء میں ادبی دنیا (لاہور) کے سالنامے میں اس شاعر کے متعلق ایک مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی نئے اور پرانے چراغ کے عنوان سے پرویز بک ڈپو دلّی سے شائع اپنی کتاب میں اردو کا جرمن شاعر فراسو اور اس کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

جارج پیش شور کے اٹھارہ بھائی بہن تھے[9] اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

تھے والد جو اپنے کثیر العیال
نہ کرتے تھے کچھ ہم بھی ان سے سوال

جارج پیش شور اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹی ایک بہن آنا (Anna) تھی جس کی شادی آگرہ کے ضلع مجسٹریٹ دفتر میں معمور کانسٹینٹائن (Constaintine) سے ہوئی۔ شور نے 1857ء سے متعلق اپنی یہ ڈائری 1862ء میں اپنے بہنوئی کو آگرہ میں شائع کرنے کے لئے دی تھی جہاں سے سرسید احمد خاں کی اسبابِ بغاوتِ ہند اور مرزا غالب کی دستنبو پہلے ہی شائع ہو چکی تھیں۔ اس بہن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ جارج کی اس بہن کا انتقال 1868ء کو ہوا اور شور نے خود تاریخِ وفات کہی ؎

ہوئی خارجی آنا کی مرگ سے
جو اس گھر پہ آئے شور ٹوٹا غضب
نہیں چھوڑا بعد اپنے کوئی چراغ
یہ گھر جس سے روشن رہے روز و شب

جو کی فکر تاریخ بولا سروش
خدا دے ان کو باغِ جنت

1868ء

جارج پیش کا چھوٹا بھائی جان کوئن پیش تھا جس کی شادی ایڈ لینڈ ڈیزیڈن سے ہوئی جو ہر چند پور میں اپنے نانا کے یہاں رہتا تھا۔ 18 نومبر 1857ء کو اس نے اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔ شور نے لکھا ہے کہ

زندگی گر عذاب ہے تجھ بن
موت بھی تو خراب ہے تجھ بن

جان کوئن کی چھوٹی بہن مریم کی شادی کرنل جیمس گارڈنر سے ہوئی جن کا انتقال ماہ رجولائی 1857ء کو ہوا۔ شور نے اپنے ایک اور چھوٹے بھائی جوزف پیش کا ذکر اپنی کتاب **"وقائع حیرت افزا"** میں کیا ہے جو علی گڑھ میں اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے انہیں ڈھائی ہزار روپیہ کا معاوضہ بھی ملا تھا۔

جارج پیش کی شادی ان کے والد کے ایک دوست گوالیار کے فوجی افسر سلاودار (Salaudar) کی نواسی مس ماریان (Miss Maryan) سے ہوئی تھی۔ شور کی پہلی شادی ہنگامۂ غدر سے قبل ہوئی تھی۔ شادی کر کے شور ہر چند پور پہنچے تو ان کے نانا فراسو نے بہت اعلیٰ پیمانے پر جشن شادی رچایا۔ آٹھ روز تک بڑی رونق اور چہل پہل رہی۔ موکلا ایک نامی طوائف تھی۔ جتنی غزلیں اس نے محفل میں گا کر سنائیں فراسو نے ان سب پر فی البدیہہ غزلیں کہیں۔ اس سے فراسو کی قادر الکلامی اور پرگوئی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[10]

ان کی یہ بیگم 1872ء میں شدید نسوانی بیماری میں مبتلا ہوئیں جس کا سلسلہ کافی جاری رہا۔ ان کے علاج کے لئے میرٹھ، دہلی اور گوالیار میں رہے اور آخر میں بیوی کو گوالیار چھوڑ کر خود دہلی میں آ گئے۔ جوانی اور فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ تفریحات و عیشات میں پڑ گئے۔ رقص و انبساط کی محفلوں میں شب و روز گذارنے لگے اور اسی دوران میں مغل جان سے معاشقہ ہوا جس کا حوالہ ان کے اشعار میں ہے۔ [illegible] برس بیوی سے جدائی رہی جب ان کی

حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں گوالیار سے آگرہ لے آئے جہاں 11 ؍جنوری 1879ء کو چونتیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور آگرہ کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ اس غم کو بھلانے کے لئے مغل جان کا آستانہ تھا بعد میں دوسرا سہارا رمضانو کا ملا کہتے ہیں ؎

اڑتے ہی مغل جان کے رمضانو پھنسی شور
صد شکر کہ خالی نہ رہا دام ہمارا

دوستوں اور رشتے داروں کی خواہش پر شور نے ایک سال کی مدت میں ہی دوسری شادی 1880ء میں گوالیار کے سوائی سکندر کی بیوہ میری پیش کوئن (Marry Pasequine) سے رچائی۔ اس شادی کا سہرا بھی خود شور نے لکھا اور اس دوسری شادی کی تقریب علی گڑھ میں ہوئی۔ شور نے اپنی دوسری شادی کا سرا خود لکھ کر اپنا ارمان پورا کر لیا۔ اس سہرے کے اشعار میں جو انداز، لب ولہجہ اور بے فکرا پن ہے، اپنی جگہ کافی دلچسپ ہے۔

شور صاحب کے بندھا آج جو سر پر سہرا
دوسرا تھا یہ مقدر میں مقرر سہرا
ساقیا دور چلے آج کہ دل خوش ہے مرا
گاؤں گاپی کے برانڈی میں ساغر سہرا[11]

اس دوسری بیوی سے ان کے دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے پیدا ہوئے۔ پہلی بیٹی 1881ء میں پیدا ہوئی جس کو جارج کی آگرہ والی بے اولاد بہن نے گود لے لیا اور یہ بچی نو سال کی عمر میں مرگئی۔ 1883ء میں دوسری بیٹی اگینس میری (Agnes Mary) پیدا ہوئی اور ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام لیو الیکزینڈر پیش (LeoElexender Puech) تھا۔ وہ 8 ؍دسمبر 1889ء کو پیدا ہوا اور یہ ان کے بڑھاپے کی آخری اولاد تھی۔

الیکزینڈر پیش کی اولاد کا نام جی ای پیش (G.E.Puech) تھا اور اس کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے بیٹے ایل اے پیش (L.A.Puech) کو ہر چندر پور ضلع باغپت کا وارث بنایا گیا اور اپنے والد کی طرح وہ بھی آنریری مجسٹریٹ تھے اور اپنی حویلی میں عدالت لگایا کرتے تھے۔ اس گاؤں کے پردھان بھورا بتاتے ہیں کہ حویلی کے جس حصہ میں وہ

عدالت لگاتے تھے آج وہاں گرام پنچایت کا دفتر ہے۔ دوسرے بیٹے موریسن اے پیش (MorrisonA.Puech) تھے جن کو باغپت ضلع کے والی فارم کی ذمہ داری سونپی گئی اور 13/ مارچ 1990ء تک وہ ہندوستان میں ہی رہے۔ ان کے کچھ خطوط باغپت کے مورخ پروفیسر ایم این شرما کے پاس محفوظ ہیں جن سے ان کی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ تیسرے بیٹے البرٹ اے پیش تھے جن کو چولہدہ کی جاگیر سونپی گئی۔ ایل اے پیش نے 26/ اکتوبر 1984ء کو جس کا خسرہ نمبر 223 ہے اس زمین کا رقبہ تینتالیس بیگھہ چودھا بسوا پختہ موضع چولہدہ پرگنہ وتحصیل باغپت میں تھی۔ یہ میرٹھ کے محلّہ کرم علی کے مسٹر ریاض الدین ولد علاؤالدین کو فروخت کردی تھی۔ ایل اے پیش کے والد جارج انچوریسٹ پیش نے 28 سو 27 مربع گز کی ہرچندر پور کی حویلی 47 ہزار 720 روپیہ میں بشیر الدین و ریاض الدین پسران علاؤالدین ساکن ہیوا تحصیل باغپت و نجم احمد پسر مرحوم سہیل احمد، محلّہ کرم علی، میرٹھ کو 30/ اگست 1986ء کو فروخت کردی[12] اور اس کے بعد یہ خاندان ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا۔ غرض کہ 1857ء میں جو زمین و جائیداد برطانیہ سرکار کی خیرخواہی میں فراسو کو ملی تھی وہ اس کے پرنواسوں نے بیچ دی اور یہودی جرمن اور فرانسیسیوں کا یہ خاندان میرٹھ چھوڑ کر چلا گیا۔

میرٹھ کے سب سے پرانے مسیحی قبرستان سینٹ جانس سیمٹری (St.John's Cemetry) جو دلی۔ رڑکی روڈ پر لیکھا نگر میں واقع ہے اور جہاں 1857ء کے غدر میں مارے گئے نو انگریزوں کی قبریں بھی ہیں۔ اسی قبرستان میں جارج پیش شوہر، ان کی بیگم میری پیش کوئن اور بیٹی کی پختہ قبریں آج تک محفوظ ہیں۔ ان تینوں قبروں سے او پر سنگ مرمر کے بنے فرشتے رقص کر رہے ہیں۔ ان قبروں کو دیکھنے سے اس خاندان کی شان و شوکت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب کہ الیگزینڈر پیش کی قبر میرٹھ کے کینٹ میں واقع عیسائیوں کے ہسپتال سینٹ لوک (St. Look) احاطے میں موجود ہے۔ ان چاروں قبروں پر ان کے انتقال کی تاریخیں بھی درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جارج پیش شوہر کا انتقال 22 / فروری 1894ء کو 72 سال کی عمر میں ہوا۔ مشہور شاعر داغ دہلوی نے ان کے انتقال پر

قطعہ تاریخ بھی کہا ہے ؎

جارج پیش آں شور صاحب باکمال
مالک ملکِ سخن طبعش بزور
عادل و بازل، دلاور رحم دل
کز ہنیش ماربو سرپائے مور
روز جمعہ بست و دویم فروری
استراحت کرد در آغوشِ گور
سالِ رحلت عیسوی بنوشت داغؔ
اہلِ عالم کرد ماتم شور شور

1894ء

مزارات پر لگے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ شورؔ کی اہلیہ کا انتقال 3 /اکتوبر 1910ء کو 52 سال کی عمر میں ہوا جب کہ دوسری بیٹی کا انتقال 27 /مئی 1902ء کو ساڑھے اٹھارہ سال کی عمر میں ہوا۔ جارج پیش کے بیٹے لیو الیکز ینڈر پیش کا انتقال 12 /اکتوبر 1930ء کو 45 سال کی عمر میں ہوا۔

جارج پیش شور کے سب سے قریبی دوست اور اردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی کے صاحبزادے حکیم فخر الدین نے جارج پیش شور کی بیوہ میری پیش کوئن کے انتقال پر ایک قطعۂ تاریخ کہا ہے ؎

میری پیش کوئن نے کی قضا
لیو پیش کو سخت ہے ملال
جو تاریخِ رحلت کی ہو جستجو
غمِ فرقت جاودانی ہے سال

1910ء

جارج پیش شور اپنی وضع قطع کے لحاظ سے مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ ہمیشہ

انگرکھا، دوپلی ٹوپی، سلیم شاہی جوتی اور تنگ پائجامہ زیب تن کرتے۔ مغربی وضع سے ممکنہ طور پر اجتناب کرتے حالانکہ ان کے عزیز و اقارب اور ہم قوم معترض ہوتے اور طعن و طنز کرتے[13] اس کا حوالہ انہوں نے اپنی ایک مثنوی میں دیا ہے ؎

یہاں تک کہ ہم پر بھی طعنہ ہوا
کہ ملتے ہیں کالوں سے یہ برملا
ہے پوشاک ہندی سے رغبت انہیں
لباسِ فرنگی سے نفرت انہیں

لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ "وہ بڑے زندہ دل، یار باش، خلیق اور متواضع منش تھے۔"[14] کریم الدین نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "طبع سلیم کے مالک تھے" "وہ بڑے صاف دل اور صاحب مروت انسان تھے۔[15] وہ اپنے ایک شعر میں اپنی انسان دوستی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

زلف کافر کے خم و پیچ سے ہرگز خالی
شور ہندو نہ مسلماں نہ کرستان رہے

شور اردو زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ شاعری کے فن اور اس کے رموز سے کماحقہ واقف تھے۔ غزل جو اہل مغرب کے لئے ایک اجنبی صنف ہے اس میں مہارت اس حد تک حاصل ہوئی کہ غزل کے مزاج، اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو پوری طرح برتنے لگے۔ کلام میں تغزل مملو ہے۔ نشست الفاظ اور تراکیب اہل زبان کی طرح، روانی، سلاست میں ان کا کلام کسی بھی اہل زبان کے کلام کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے استاد قطب الدین مشیر دہلوی نے ان کے کلام کے بارے میں کہا ہے ؎

یعنی ہر علم کے وہ کامل ہیں
ختم ان کا ہوا ہے اب دیوان
دیکھا دیوان اس مشیر نے جب
خوب آئی پسند طرز زبان

جارج پیش شوؔر کی تربیت جاگیردارانہ نظام کے تحت ہوئی تھی۔ اس لئے وہ وسیع المشرب انسان تھے۔ ہر مذہب وملت کے افراد سے ان کے پرخلوص تعلقات تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں غالب، داغ کے علاوہ ہرگوپال تفتہ اور مظفر علی راقم بھی شامل تھے۔ وہ بڑے صاف دل اور صاحبِ مروت تھے۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ انہیں موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ ان سے بہت سی ٹھمریاں، بھجن اور دادرے منسوب ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس سے انہیں خاصہ شغف تھا۔ ہمہ وقت فکرِسخن میں محو رہتے تھے اور انہیں ہر صنفِ سخن پر عبور حاصل تھا۔

میرٹھ کے ویسٹرن کچہری روڈ پر وہ اٹھارہ بیگھ کی ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ یہ کوٹھی کسی زمانے میں بیگم سمرو کی ملکیت تھی اور وہ جب بھی یہاں قیام کرتیں، شعروشاعری کے ساتھ رقص وموسیقی کی محفلیں جمتی تھیں۔ آج اس کوٹھی میں آسمان سے چھوتی عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں۔

میرٹھ کے نواب اشارت علی خاں متخلص صدؔق نے شوؔر کے چوتھے دیوان (مطبوعہ 1888ء) میں تقریظ لکھی ہے جسمیں شوؔر کے حالات بیان کئے ہیں۔

''شور کا شور ہے۔ نہ کھانے پینے کی فکر، نہ نوکری کی ہوس، تین شعری مجموعے اب تک شائع ہوچکے ہیں، چوتھا تیار ہے، یاروں کے یار، دیہات کے دیہات ان کے کنٹرول میں نہ کسی سے لگان کی سختی۔ ایک کوٹھی دیوانی کچہری کے بیچ نالہ بیچ میں شہر اور صدر کے بیچ میں۔ دو بیٹوں سے گھر روشن ہے۔ مسٹر فرانسیس کوئن صاحب ان کے نانا بڑوت ضلع میرٹھ کے تحصیلدار تھے۔ سرکار کی خیر خواہی میں 1857ء میں برٹش سرکار کی حمایت کرنے پر تین گاؤں انگریز سرکار کی طرف سے انہیں دئے گئے۔ شاعری میں ان کے کلام کی شہرت دور دور ہے۔''[16] غدر کے وقت شوؔر کی عمر 34 سال تھی۔

شوؔر کے استاد حافظ قطب الدین مشیؔر دہلوی نے ان کی شاعرانہ عظمت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

پیش صاحب ہیں حاتمِ دوراں
ان سے سرسبز ہے یہ باغِ جہاں
آبِ زر سے نہال ہے خلقت
یعنی شاداب ہے نہالِ جاں
شعر گردوں ہے قصر رتبے میں
وہ ہیں والا ہمم بلند مکاں

شعر گوئی میں ہے وہ خاقانی
وصف کرتے ہیں سب معانی داں
مصرعۂ ہر غزل ہے سرو چمن
بلکہ ہم شکل قامت خوباں
شورؔ کہتے ہیں تخلص اپنا ہی
ان کی کیا زور شورؔ کا ہو بیاں

تذکرہ روزِ روشن میں مظفر حسین صبا لکھتے ہیں:

"......ان کا مولد و منشا اگرچہ دلی رہا ہے لیکن آج کل چونکہ نانہالی ترکہ سے ایک بڑی دولت ان کے ہاتھ لگی، اس لئے میرٹھ میں مقیم رہتے ہیں۔[17] دن رات جام و مینا سے کام ہے۔ بڑے باوقار، یار باش اور خوش طبع ہیں۔"

شورؔ کے شاگردوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ مرحوم مشتاق شارق نے شورؔ کے ایک شاگرد الف مجلی کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے[18]

زمانہ آیا ہے کیسا نازک ہر اک کی جان سے چل رہی ہے
نہ ایک ساتھی ہے دوسرے کا طریق الفت بدل رہی ہے

مگر شورؔ نے اپنے بے شمار شاگردوں کا ذکر ایک شعر میں کیا ہے

شاگرد تیرے شوؔر جہاں میں ہیں جا بجا
جاری سخن کا خوب ہوا تیرے گھر سے فیض

رام بابو سکسینہ نے اپنی مشہور تصنیف **''یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین''** میں شوؔر کے دو فوٹو شامل کئے ہیں۔ ایک ان کی جوانی کے دور کا ہے جس میں وہ ٹائی اور سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں اور دوسرا فوٹو ان کے بڑھاپے کا ہے اس میں وہ کشمیری کڑھا ہوا گاؤن اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ سر پر گول ٹوپی ہے جو ایک طرف کو جھکی ہوئی ہے۔ شور کشیدہ قامت تھے، جسم گداز تھا، چہرہ بڑا اور کچھ کچھ گول تھا، آنکھیں کچھ چھوٹی تھیں، مونچھیں بڑی اور گچھے دار تھیں۔ اس حلئے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت پروقار تھی۔[19]

جارج کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ میرٹھ کے تمام شعرأ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ایک فرنگی ہونے کے باوجود وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے دلدادہ تھے اور دوسرے ہم مذہبوں کی طرح انہیں حقارت سے نہیں دیکھتے تھے۔ سستی مغربیت ان کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنی تمام زندگی ایک مہذب ہندوستانی کی طرح بسر کی۔ میرٹھ میں ان کا خاندان تہذیبی اقدار کا حامل تھا اور اس کا شمار باحیثیت خاندانوں میں ہوتا تھا۔ جارج پیش شور کی وفات کے بعد ان کا بیٹا الیگزینڈر لیئو پیش (Leo Puech) مدت تک میرٹھ میں اسپیشل مجسٹریٹ کے اعزاز سے سرفراز رہا۔ لیئو پیش کی اولاد کو بھی یہ اعزاز حاصل ہوا۔ ہر چند پور کے گاؤں والے آج بھی اس خاندان کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے پڑپوتے اپنے گاؤں کے کسانوں کا میرٹھ میں مفت علاج کراتے تھے اور ان کے رہنے سہنے کے لئے بھی اپنی حویلی کا حصہ گاؤں والوں کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

جارج پیش شوؔر نے اپنے حالاتِ زندگی خود بیان کئے ہیں۔ تین سو سولہ صفحات پر مشتمل ایک سوانح عمری 1894ء میں ہاشمی پریس میرٹھ سے شائع ہوئی۔ یہ مثنوی ان کے سوانحی حالات پر مشتمل ہے۔ یہ اب نایاب ہے[20] وقائع حیرت افزاء میں بھی انہوں نے اپنے حالات درج کئے ہیں اور اپنے شعری مجموعوں میں بھی اپنی زندگی پر روشنی

ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''عرصۂ دراز سے یہ خاکسار ذرۂ بے مقدار گردشِ سہ پہرے بے مہر سے مہرۂ مقید کی طرح خانۂ دلنشیں و بیکار تھا۔ غمِ تنہائی و رنجِ بے سروپائی دستِ شکستہ کی طرح گلے کا ہار تھا۔ بعد ایامِ غدر 1857ء کے رازقِ مطلق نے اپنی عین عنایت و خوانِ نعمت سے آب و دانہ بہم پہنچایا یعنی مسٹر ولیم فورڈ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر گوڑگاؤں نے قدر دانی و فیض رسانی سے کہ حاکمِ ثانی ہیں، اول محکمہ پولیس قصبہ ریواڑی میں ممتاز فرمایا۔ آب رفتہ بھجوایا چنانچہ تین مہینے تک دو چار یاروں میں خوب گزر ہوئی، بے کشش و پنج بسر ہوئی، اسی عرصہ میں اتفاقِ حسنہ سے مخلص با اخلاق محبِ سراسر اختصاص غنی خاں خلقتِ نشاں محمد عبدالنبی خانصاحب رشتہ دار نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم والیٔ جھجر سے بادیگر اقارب ان کے ومحمد فصیح الدین صاحب قاضی جھجر ریواڑی سے ملاقات ہوئی، عجب طرح کی صحبت دن رات ہوئی فلک کو بھی رشک آیا، خیالِ تفرقہ پردازی اس کے دل میں سمایا۔ خان موصوف اور قاضی صاحب کو دیکھا تو معۂ ہمراہان اپنے شورشِ غدر سے فتنۂ آخرالزماں و قیامت صغریٰ کا نتیجہ تھا۔ ممات کو حیات پر فائق و لائق جان کر اس پر دل نہادہ تھے اور جامِ فنا نوش کرنے پر ایک مائل ہو کر سر سرِ خزاں روزگار سے جو بلبل دورازِ گلزار افتادہ تھے، مکائد تباہی و شدائد جاں کاہی میں وطن سے دور چمن سے مجبور ہجوم یاس سے حیراں و سرگشتۂ گردشِ زماں سے پریشاں و دل خستہ بقول شخصے ؎

گھر سے بے گھر ہوئے اور شہر و وطن سے نکلے
شکوے آئے نہ زباں پر نہ دہن سے نکلے

گوڑگاؤں (ہریانہ) کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ولیم فورڈ کی مدد سے انہیں پہلے قصبہ ریواڑی میں پولیس کی ملازمت مل گئی اور کچھ عرصہ بعد تبادلہ کر کے انہیں [illegible] اسسٹنٹ گرداوری کا عہدہ دیا۔ انہیں ضلع روہتک کلہاوری کی چھوٹی سی بستی پر متعین کر دیا گیا جو بستیوں سے دور دہلی کی شاہراہ پر واقع ہے۔ کلہاوری کی اس تبدیلی میں اتفاق سے ان کی ملاقات پرگنہ سانپلہ کے تحصیلدار منشی دیوان لال سے ہوئی جو بڑے ذوق و شوق سے شعر کہتے تھے۔

دو تین برسوں کی ملاقاتوں کا یہ اثر ہوا کہ جارج پیش کے قلم سے بھی اشعار کے موتی ٹپکنے لگے۔

ایک دن منشی ہر جیون لال نے شورؔ کو اپنا دیوان مکمل کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ بات دل کو لگی، طبیعت کو جوش آیا، اشعار کا تانتا بندھا اور اوراق مرتب ہونے لگے۔ اس دوران میں شورؔ کی ملازمت جاتی رہی مگر شعروں کی آمد جاری رہی۔ بالآخر 1864ء میں دیوان مکمل ہو گیا اس میں انہیں پانچ برس لگے۔ اب اس پر کسی استاد سے اصلاح لینا ضروری تھا۔ ان ہی دنوں حافظ غلام دستگیر دہلی سے میرٹھ پہنچے۔ انہوں نے دیوانِ شورؔ پر نظر ثانی کی اور اس طرح یہ دیوان چھاپا خانے تک پہنچا۔[21]

جارج پیش شورؔ کا جب دوسرا دیوان تیار ہو گیا تو جارج کے سب سے عزیز ترین دوست شاگردِ غالب حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی نے قطعہ تاریخ کہا۔

چھپتا ہے یہ شور کا جو دیوان
بینا کن چشمِ نور ہے یہ
ہر شعر ہے دلفریب اس کا
دیوان نہیں دل کا چور ہے یہ
بے فکر ہے آمدِ مضامین
اس طبع رسا کا زور ہے یہ
لاکھ طبع کی دل سے رنجؔ تاریخ
مرغوب کلامِ شورؔ ہے یہ[22]

1877ء

خود جارج پیش شورؔ نے حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی کے انتقال کے بعد ان کی کلیات مخزن الفصاحت کی اشاعت میں گہری دلچسپی دکھائی جس کا اعتراف رنج کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین نے کیا ہے۔[23]

جارج پیش شورؔ نے رنج میرٹھی کی کلیات جو 1891ء کو مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع

ہوئی اس میں شوؔر کی تقریظ وقطعہ تاریخ شامل ہے۔شوؔر فرماتے ہیں کہ'' بعد از انتقال اس جانِ سخن کے لطفِ حیات میرا بالکل جاتا رہا۔ ایسا جادو کلام و دوست مقبول انام فی زمانہ کہاں جس روز سے رنج نے اپنی مفارقت سے رنج دیا زندگی بدتر ممات ہے، صدمۂ حسرت جانِ حزیں پر دن رات ہے۔مذاقِ شاعری بعد ان کے کافور ہوا۔ قدر شناسانِ سخن کا شیشۂ دل اس سنگِ الم سے چور ہوا۔شوؔر ہمیشہ ان کی یاد میں نالہ و بکا کرتا ہے۔ ان کے ذکرِ خیر کا جا بجا دم بھرتا ہے۔ خدا اس مغفور کو غریقِ رحمت عطا فرمائے اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو صبر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ طالبانِ رنگیں وطبع شیریں گفتار اس نسخۂ نادر کو تفریحِ خاطر کے لئے برگِ حنا کی طرح ہاتھوں ہاتھ لے جائیں گے۔ ناظرین نکتہ بیں اس سواد سویدا کو بصد میل خاطر آنکھوں سے اٹھائیں گے۔ جہاں تک تعریف اس کی ہو کم ہے۔ مطبوعہ طبع عالم ہے''۔

شوؔر نے رنجؔ کی وفات پر جو تاریخی قطعہ کہا اس کو اپنے چوتھے دیوان میں بھی شامل کیا ہے[24] ۔

خوشی شوؔر کی لے گئے اپنے ساتھ
نصیب اس کو ہے اب غم و رنج آہ

1302ھ

اردو نثر میں انہوں نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرز تحریر کو اپنایا۔ فسانہ عجائب کے اس مصنف کی شاگردی کو غائبانہ تسلیم کیا ہے اور 1857ء کے واقعات، حالات اور حادثات کو لکھ کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا جب کہ شاعری میں انہوں نے غزلیات کے علاوہ مثنویاں، رباعیاں، قطعات، قصائد، مسدس، مخمس اور سہرے سب ہی اصناف میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا۔ حضرت داغؔ نے انہیں ''مالک ملک سخن'' قرار دیا۔ ان کے مرتبہ کا تعین کچھ مشکل نہیں۔

حوالہ جات

(1) جرمن نسل کا ایک اردو شاعر: پیارے لال شاکر۔ سالنامہ ادبی دنیا، لاہور، صفحہ 73

(2) تلامذۂ غالب از مالک رام صفحہ 124

(3) اردو کا جرمن شاعر فراسو، از ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ 81 نئے اور پرانے چراغ

(4) وہائٹ مغلس، ولیم ڈیل رمپل، ص 143، پینگوئن بکس، نئی دہلی 2002

(5) 1857ء کے مجاہد شعرا: از مولانا امداد صابری، صفحہ 32، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی

(6) لاسٹ مغل، ولیم ڈیل رمپل، ص 239

(7) گلشنِ بے خار، صفحہ 385 نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

(8) رام بابو سکسینہ۔ یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین

(9) گلبانگ وحدت، نور احمد میرٹھی، ص 277، ادارۂ فکر نو، کراچی 2007

(10) جرمن نسل کا ایک اردو شاعر: پیارے لال شاکر۔ سالنامہ ادبی دنیا، لاہور

(11) دیوانِ شور، سوم، ص 203

(12) دستاویزات رجسٹری دفتر، تحصیل باغپت

(13) تذکرہ شعرائے اردو میرٹھ، صفحہ 37 مرتبہ نور میرٹھی

(14) خم خانۂ جاوید۔ لالہ سری رام

(15) تذکرہ مولوی کریم الدین

(16) دیوانِ شور، مطبوعہ 1888ء

(17) تذکرہ روزِ روشن۔ مظفر حسین صبا

(18) مشتاق شارق۔ دبستانِ میرٹھ (مخطوطہ)

(19) رام بابو سکسینہ۔ یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین

(20) جارج پیش شور کی تصنیف: نسرین ممتاز، صفحہ 13 آج کل، نئی دہلی، مئی 1989ء

(21) اردو کا ایک یوروپین شاعر جارج پیش شور، رضا علی عابدی، مخزن، شمارہ نمبر 5 پاکستان

(22) رنج میرٹھی، راحت ابرار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(23) تقریظ جارج پیش شور، صفحہ 115-116 مخزن الفصاحت مطبع ہاشمی میرٹھ (1891)

(24) دیوانِ شور، پولس پریس، میرٹھ

باب سوئم

جارج کی ڈائری: وقائع حیرت افزاء

حمد وسپاس اس خدائے پاک کو ہے جس نے رائی سے پربت بنایا اور پربت کو پھر رائی کر دکھایا، تختۂ چمن گیتی کو گلہائے رنگا رنگ قدرت اپنی سے شگفتہ فرمایا۔ ہر ایک گل کا رنگ و بو جدا جدا کر دکھا کر باغِ روح افزا لگایا، کہیں بلبل بے خوف باغبان برگِ گل پر فریفتہ ہے، کہیں قمری بے بیم ضیائے سروِ آزاد پر شیفتہ ہے۔ اس کی نیرنگیوں کے مشہور فسانہ ہیں۔ آدم خاکی اس کی قدرت کے دیوانے ہیں، کیا حوصلہ اس مشت خاک گار کا کہ جو توصیف خالق لیل و نہار آں زرگار کی تقدیم پہنچاوے اور کیا طاقت اشہب چالاک خامہ کہ زبان کی بیچ میدان شان اس کی جولانی دکھاوے بقول اینکہ وہ ایسا ہی یکتائے معبود ہے قلم جو لکھے اس سے افزوں ہے بعد حمد اس خلاقِ عالم کے نعت وثنا حضرت مسیح برگزیدۂ کائنات مجسم کرامات کے ہے جس کے چراغ ہدایت سے تیرہ بختوں وگم گشتیوں کے دل و جان روشنی جاوید پر آئے اور اس کے کلام معجز نظام کو تحقیق وتصدیق جان کر مرتبہ اعلیٰ پائے۔ اس کے حق میں حکم "قم باذن اللہ" درحق سے آیا ہے۔ دیکھو تو کسی اور نے بھی ایسا رتبہ اس دنیا میں پایا ہے۔ غرض کہ صفت اس شفیع کی امر محال ہے، زبان ناطقہ اس بیان میں لال ہے۔

سببِ تالیفِ کتاب

عرصہ دراز سے یہ خاکسار ذرہ بے مقدار ولیم جارج پیش قدم [illegible] متوطن شہر کول ضلع علی گڑھ مکروہات روزگار میں مبتلا رہ کر تنگی معیشت زندگی بسر کرتا تھا، باوجود اس زمانہ سے دم بدم افسردگی بڑھتا تھا کہ اس عرصہ میں بہ سال 1857ء رازق مطلق نے اپنے خوان

نعمت سے رزق مجھ کو پہنچایا، محکمہ پرمٹ میں دو قرص نانِ جویں سے لگایا۔ ایک روز حسبِ اتفاق چند یارانِ طریقت و دوستان با محبت باہم سرگرمِ گفتگو تھے۔ نیرنگی زمانہ نہ ہنجار و کجروی یہ فلک کینہ شعار زبان پر لا کر فرمانے لگے کہ اے جارج پیش صاحب جن جن صاحبان پر آفاتِ غدر و قیامت اکبر گزریں سب نے سانحہ اپنا اپنا بطور یادگار رقم فرمایا اور چھاپے میں مشتہر کروایا مگر افسوس کہ باوجود طبع عاشقانہ مزاج رندانہ آپ کی توجۂ خاطر اس طرف کیوں کر نہ آئی جو آج تک کوئی کتاب اپنی حقیقت کے تصنیف نہ فرمائی۔ واہ کیا خوب یہ کاہلی اور یہ جوانی یہ غفلت اور یہ سخندانی بہ قول میر تقی میر

نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے نام خدا ہو　　　جواں کچھ تو کیا چاہئے

یعنی آپ بھی کچھ سرگزشت اپنے بروئے خامہ لا کر تدبیر مایا بقا فرمایئے اور سامعین کو عبارت رنگین اس کی سے مسرور کرنا چاہئے ہر چند کہ بہ اجز و استماع اس کلامِ دوستوں کو عذر عدم فرصتی و بندگی یہ بیچارگی برزبان لایا۔ اِلّا کسی صاحب نے التفات اس پر نہ فرمایا انجام کار یہ کلمۂ توسن طبع کو تازیانہ ہوا، اس وقائع کی تحریر کا بہانہ ہوا، القصہ چشمداشت ناظرین و سامعین سے یہ ہے کہ بچشمِ عیب پوشی ملاحظہ فرما کر جس جگہ سہو یا غلطی نظر آئے اس کو پردۂ اصلاح سے ڈھکا جائے کس واسطے کہ مصنف فسانۂ عجائب نے فرمایا ہے کہ طبیعت کیسی ہی متین و عالی ہو ممکن نہیں جو بشر خطا سے خالی ہو۔ غرض کہ دوستوں کی خوشی سے کام رکھا اور سانحہ غدر کا لکھ کر وقائع حیرت افزا اس کا نام رکھا۔ آغاز داستانِ حیرت بیان گرہ کشایان سلسلۂ سخن و تازہ کندگانِ فسانہ کہن نے اشہب خامہ کو بہ میدانِ بیان اس طرح پر گرمِ جولاں کیا ہے کہ واقع یکم ماہ مئی 1857ء کو یہ عاصی حسبِ اتفاق زمانۂ دور پیشی امورات خانہ کہ اس ایام میں محض بیکار و غمگین بسیار تھا وارد شاہ جہاں آباد مینو سواد ہوا چنانچہ ایک ہفتہ تک بصحبت احباب وہاں غم غلط فرمایا اور امورات ضروری کو بھی بہ انجام پہنچایا۔ زانِ بعد یکشنبہ تاریخ 9ر مئی 1857ء کو آیا اس روز حسبِ معمول مستمرہ کلکتہ کے دروازے کی سمت پر لبِ دریائے جمن ایک میلا و البیلا ایسا ہوتا تھا کہ جس کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ خاص و عام پر اس کا سماں از ارض تا سماں اب تک ظاہر و ماہر ہے حاصلِ کلام دوستوں نے

ترغیبِ سیر اس کی مجھ پریشانِ خاطر کو دلائی اور باوجود عذرات چند در بسینہ مخلصی ان سے نہ پائی۔ آخرالامر ہمراہِ رکاب تنے چند احباب ذکر اس سیر گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ چاندنی چوک۔ سے لگا کر تا بہ سلیم گڑھ لبِ جمن ہجوم مخلوقات سے سر پر ٹھاٹے پھرتی ہے اور نظرِ ناظرین جھوک کھا کر گرتی ہے۔ قدم تیز اٹھانا اچھے لوگوں کو اس وقت دشوار ہے، ہماں شماں کا تو کیا شمار ہے غرض بہ ہزار کشتی و دھینگا مشتی اس سیر گاہ میں پہنچا جہاں قدرتِ خدائی نظر آتی تھی، بہشتِ بریں شرماتی تھی، دیکھا کہ ایک طرف شہزادہ و سلاطین و روسائے پر تمکین صفِ اسپانِ فیلان پر بہ پوشاک مرصع وصورتِ مرقع سوار ہیں۔ آگے ان کے ماہی مراتب و زریں اعصا بردار ہیں اور ایک طرف صفِ پیادگان نو جوانِ خوش گزاران اس کثرتِ ہجوم سے آراستہ ہے کہ صبا و نسیم کو بھی آگے جانے کا نہیں ملتا راستہ ہے۔

بازار دورویہ ہر یک ایستادہ نفیس کا اس صفائی و قماش سے لگا ہوا ہے کہ نظر پھسلتی ہے ہر ایک شہ پر چلتی ہے۔ بزاز ایک طرف دوکانِ پارچہ کھلی ہوئی ہے۔ ہر ایک کو واسطے خریداری پر چاتے ہیں۔ حلوائی دوسری طرف بیٹھے ہوئے اپنی شیریں کلامی سے لبھاتے ہیں۔ میٹھی بات کے سوا اور نہ بات سناتے ہیں۔ ایک سمت تنبولی اپنی بولی میں سرخروئی اپنی دوکان کی جتا رہے ہیں اور چبا چبا کر باتیں بنا رہے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خریدارو آؤ کیا خوب پانوں کی ڈھولی ہے ابھی کھولی ہے جو کوئی ایک بیڑہ کھائے گا اس بیڑہ کا منھ جنم بھر کو لال ہو جائے گا۔ ایک رخ مالن و مالی بوضع نرالی ٹوکرہ گلوں سے آگے رکھے ہوئے پھر رہے ہیں کہ بیلے کے پھول و ہار پر بہار ہیں شوقین والبیلی کے لئے تیار ہیں چنانچہ جس کا دل اس ہار کے لینے پر آیا پھولا نہ سمایا۔ جا بجا بہشتیوں کے کوروں کی جھنکار ہے پانی بے آب دار ہے جو کوئی ایک کورہ چاہے کوڑی دے کر پی جاتا ہے آب زمزم کا مزہ اس کو آتا ہے۔ [illegible] نابکار ایک طرف اپنی لن ترانی سنا رہا ہے اتنے بڑے کا مزہ چکھا رہا ہے کسی کو چلو میں الو کر دیتا ہے کسی کا قدح اپنے قدح کی خیر میں [illegible] دیتا ہے۔ کوئی شراب پی کر اپنے ساقی کے تصور میں بجائے گزک دل کا کباب کھا رہا ہے کوئی یہ شعر استاد کے شائقوں کو سنا رہا ہے نظم

ساقی قدح شراب دے دے مہتاب میں آفتاب دے دے ساقی باقی جو کچھ ہو لی باقی

ساقی شراب دے دے ہجوم پریوں سا ہر دو طرف اس قدر ہے کہ دل کے پھنس جانے کا ہر شائق کو ڈر ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی طرز و شان سے رتھ و بیلی و پالکی میں بیٹھی ہوئی ماہِ چہاردہ نظر آتی ہیں بیک نگاہ کام ناظرین تمام کر جاتی ہیں جس کو مہربانی سے دیکھا نہال ہو گیا جس پر غضب ناک ہوئی پیٹ پکڑ کر پامال ہو گیا۔ اس میلہ جھمیلہ سے جب آگے بڑھے تو دریائے جمن اپنی لہروں سے ہم کنار تھا اور شور روز کا عجب پر بہار تھا۔ آگے آگے گوہرِ بے بہا صدف سے سیرِ دریا کے مشتاق ہیں۔ باہر نکل کر سطح آب پر بہا آتا ہے پیچھے اس کے دریا دلوں کا دل اس کے بکف لانے میں حسرت سے ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ الغرض بات اسی بحرِ ذخار کے پانی مشکل دیکھ کر جہاں سے موجِ طبیعت درکنار ہوئے۔ دیدِ گل رخاں پھر گلے کا ہار ہوئے۔ یہ سیر و تماشہ تا غروبِ آفتاب ہمراہِ احباب بخوبی دیکھ کر اس قدر لطف اٹھایا کہ بہشتِ بریں کو دل سے بھلایا۔ بعدہ قریب آٹھ بجے رات کے غریب خانے پر واپس آکر ٹک دم لیا۔ اتنے میں آواز چنگ و رباب ہمسایہ کی طرف سے کان میں آئی۔ کسی نے اسی وقت آکر یہ خبر سنائی کہ لالہ رام جی داس ساہوکار باوقار جو گڑ والا مشہور ہیں ان کے دولت خانہ پر ایک شخص کتھک کا رقص کر رہا ہے اور وہ اپنے کرتب سے عقل و ہوشِ ناظرین کھو رہا ہے یہ سنتے ہی بقول شخصے مصرعہ ؎

سرود خانۂ ہمسایۂ حسن رہگذری
شوق نے پھر دل کو اشتعالک دی

اور بہ اتفاق انہیں احباب کے اس طرف کی راہ لی جو کہ زیرِ دیوارِ مکان اپنے وہ جلسہ ہو رہا تھا لہٰذا بے منت بالائے بام اپنے سے بخوبی نظر آیا۔ غور کر کے جو دیکھا تو تماشہ قدرتِ الٰہی کا اس میں پایا یعنی فی الحقیقت جانکی داس نامی ایک کتھک لکھنوی وہاں رقص کناں تھا۔ سحر سامری اس میں بے گماں تھا۔ ہر ٹھوکر سے دل ہائے سامعین کو پامال کرتا تھا ہر رزمۂ اشارہ اس کے سے تنِ مردہ دمِ زندگی بھرتا تھا۔ گھنگرو کی جھنکار کا رقم باذ اللہ فرماتے تھے گردشِ چشم اس کے فلک کو چکراتے تھے۔ طرفہ تہ یہ کہ تھالی زیرِ پا رکھ کر آواز ہر ایک گھنگرو کی الگ الگ سنا رہا تھا گویا دل و جانِ ناظرین کو چٹکیوں میں اڑا رہا تھا علاوہ اس کے بنایا اس کا ایک اور

آفت پر قیامت تھا کہ جس سے شام محفلِ نقشیں دیوار تھے۔ ششدر و لاچار تھے۔ جو ہاتھ کسی کی طرف اٹھا کر کچھ بتاتا اس کو پیٹ پکڑ کر زمین پر بٹھاتا، کبھی گردشِ چشم سے دل نکال لیا کبھی اشارۂ ابرو سے جان کا سوال کیا اس وقت یہ شعر کسی استاد کے مجھے یاد آئے۔ احباب کو پڑھ کر سنائے۔

یہی رنگِ قدرتی تیرے اے یار پاؤں میں
مہندی لگائے پھر تیرے بے زار پاؤں میں
قم بہ اذنی تیرے ہر ہر قدم پہ ہے
لب میں تو تھی اب آ گئی گفتار پاؤں میں

جو کہ ایسا طلسم تمام عمر اس عاصی کی نظر سے نہ گزرا تھا اس واسطے ساری شب کو بدید اس کے گنوایا پھر صبح کو جو دیکھا تو عالمِ بے خودی سے خود کو نہ پایا۔ اس عرصہ میں جب مہ تاب اپنے گوشۂ عافیت میں جا بیٹھا اور آفتاب آنکھ ملتا اٹھا تب وہ جلسہ بھی اختتام ہوا۔ پھر جینا بھی حرام ہوا آخرش بندۂ بے حواس پریشاں اپنے کو جا بجا سے جمع کر کے دہلی سے بہ حسبِ ضرورت قصد ہر چندر پور گھر اپنے کا کیا اور چھ بجے صبح تاریخ 10 مئی 1857ء کو اس طرف کا راستہ لیا اور دلِ مضطر کو اسی بزم شہر آشوب میں چھوڑ دیا۔

شروع ہونا غدر کا میرٹھ سے تاریخ 9 مئی 1857ء کو اور 10 ماہ مذکور پہنچنا اس غلغلہ کا دہلی میں بہ ہزاران شور قیامت پر ملامت بلبل نواسنج ہزار داستان وطوطی خامہ خوش بیان اس سانحۂ جاں سوز جگر دوز کو سن کر گلشن تقدیر میں اس طرح نعرہ زن ہے کہ نیرنگ فلک کج رفتار سے یکایک غدر کی آواز کان میں آئی جس کا وہم و گمان نہ تھا۔ وہ ہجوم خاقت نے مچائی بقول شخصے بیک ساعت، بیک لحظہ، بیک دم دگرگوں مہ شود احوال عالم ... بعد طے مراحل و قطع منازل دہلی سے چل کر جب 12 بجے دوپہر کو تاریخ 10 مئی 1857ء مقام ہر چندر پور پاس مسٹر فرانسس کوئن صاحب نانا اپنے رئیس ہر چندر ... پہنچا ہنوز تھکان راہ سے ٹک تسکین نہ پائی تھی اور گفتگو مری نانا صاحب سے اختتام پر نہ آئی تھی کہ ناگاہ اپنے نوکر و خدمت گزار رعیت و زمیندار سب اغیار مختلف ... افواج سرکاری واقع

میرٹھ و دہلی کا سنا کر ہوش اُڑانے لگے۔ خبر قتل بقیل کی سنانے لگے چنانچہ اس دم حاضرین کو معہ صاحبِ خانہ ہنسی آئی اور تصدیق اس کی نہ ہوکر راویان کو چشم نمائی فرمائی۔ اس چرچے کو ساعتے نہ گزرے تھے کہ مسافرانِ دور و نزدیک اثنائے راہ دہلی و میرٹھ سے بہ حالتِ کشتہ وخستہ اسی راہ سے گزرے کسی نے کہا اے صاحب آپ نے بھی سنا کہ کل افواجِ میرٹھ میں فتور رہا اور قتلِ دہلی آج بالضرور ہوا کوئی بولا میں راستے میں دستِ ظلم دہقانوں سے لُٹ گیا مال و مطاع میرا ہاتھ سے سب چھوٹ گیا ایک نے کہا کہ میں ابھی میرٹھ کے راستے پر دو آدمی زخمی کو تڑپتے دیکھ آیا ہوں۔ دوسرا بولا میں بھی سڑکِ دہلی پر چار مسافروں کی لاش دیکھ کر بھاگا ہوں۔ اس ضمن میں سب زمینداران و نمبرداران ہر چندر پور کے بھی ہوشیار و مستعد ہوکر آئے کہ صاحبو اپنی جان کی خیر مناؤ بساطِ انبساط کو اٹھاؤ جب یہ چرچا ہر چہار طرف سے بہ زورِ شور عیاں ہوا تب تو خود بخود یقینِ بے گماں و ہوش پتراں ہوا، سوچا کہ کچھ ضرور دال میں کالا ہے جو یہ ماجرہ نرالا ہے پھر تو ایک کھلبلی سی سارے گھر میں پڑ گئی چھکے چھوٹ گئے سب خورد و بزرگ کے بت بسر گئے۔ تب ہزاراں ہزار شکرِ معبود ادا کیا کہ اگر تاریخ 10 رمئی کو یہ خاکسار دہلی سے چل کر ہر چندر پور نہ پہنچ جاتا تو بے شک تیغِ بے دریغ سے سر اپنا جدا پاتا کس واسطے کہ بعد روانگی میرے مکان مسکونہ پر محلّہ کے بدمعاش اور واقف کار سرگرمِ پیکار پیادہ و سوار جوق جوق کر کے آئے اور ہمسایوں سے کہا کہ اس فرنگی بچے کو جلد لاؤ اس کا کھڑی پنچہ بتاؤ۔ غرض بعد تجسس بسیار جب پتہ کی صورت ہاتھ نہ آئی تو تب پتہ توڑ ہوا کھائی۔ دوسرے تیسرے روز میرٹھ و دہلی سے مردمانِ معتمد ہر چندر پور میں آئے ان سے یہ رازِ بستہ صاف کھل گیا کہ میرٹھ کی فوجِ تلنگان وغیرہ ہندوستانی کی سرکار سے بے ایمانی اختیار کر کے اوپر حکم کاٹنے کارتوسِ جدید کے ہنگامۂ محشر برپا کیا دستِ سفاکی کو صفا کیا یعنی چشمِ زدن میں جو صاحب والاشان عالی دودمان روبرو اس فوجِ برگشتہ کے آیا معہ زن و بچہ تیغِ بے دریغ سے خون اس کا بہایا اور آتشِ غضب سے اسی دم تمام بنگلہ و کوٹھیاتِ مسکنِ حکام کو معہ دفتر ہائے ہر ایک مقامِ سوختہ وافروختہ کر کے دودِ بلاخیز و شعلۂ شورانگیز اس کا تا بہ فلک پہونچایا بعد اس گردے کے اس فوجِ گرد آباد نے شباشب دہلی کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر اسی

طرح خونِ ناحق شمشیرِ بے رحمی سے بہایا، تمام شہر پر قبضہ فرمایا پھر تو ایک ہفتہ تک دستِ ظلم افواجِ نمک بہ حرام سے دہلی کے شہر و کیمپوں میں وہ قتلِ عام صاحبانِ والا مقام ہوا کہ جس سے تختۂ زمین سرخ و پشیمان سیہ فام ہوا۔ خوب چہار طرف سے لوہا برسا بوند بھر پانی کو ہر ایک زخمی ترسا اس حال کو دیکھ ساتوں طبق زمین کے تھرائے، آسمانوں کو چکر ہوا، فرشتے گھبرائے وہ کاسۂ سر شاہانِ وقت اپنے صاحبانِ سکندر بخت کے کہ جو مثلِ آفتاب و مہتاب درخشاں تھے حبابِ دریا کی طرح بہتے نظر آتے تھے دھڑ ان کے جوئے خون میں دھڑ ادھڑ غوطہ کھاتے تھے۔ افسوس صد افسوس مصرعہ ؎

دیدۂ سمندر سے سوا ہوگیا
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا
یہ بھی نہ پوچھا کبھی صیاد نے
کون رہا کون رہا ہوگیا

آخر کار جب دہلی میں صاحبِ جنت مکان کا نام و نشان نہ رہا تب کالوں نے روسیاہی اختیار کر کے شہر میں مقام کیا اور چار طرف سے اپنے ہم جنسوں کو طلب کر کے سامان جنگ صبح و شام کیا۔ اس عرصہ میں افواجِ قاہرہ گورہائے سرکار دولت مدار کے بھی آراستہ و پیراستہ ہو کر برائے پانی پت و کرنال وارد پہاڑی ہوئے اور آخر جنگ طرفین کی تیاری ہوئی۔

<u>شروع ہونا جنگ وجدل</u> گورا کالوں کا اور اٹھنا فتنہ وفساد و دہقانوں رذالوں کا بگڑنا شہنشاہِ وقت کا اور بننا رعایا کم بخت کا محرران عطارد رقم و منشیان زود فہم یہ حوالہ قلم فرماتے ہیں کہ جب مردمان دیہاتی و کم فہمان قصباتی نے یہ سنا کہ بالفضل عمل داری سرکار ابد پائیدار میں کچھ تخلل واقعہ ہوا تب تو ایک ایک گنوار دو دو یار ہزار من کا ہو ہو کر لڑنے کو تیار مرنے مارنے کو اٹھا سو بار۔ اپنی حقیقت اور لنگوٹے کی کیفیت بھول گیا وہ بندش کی ... بھول گیا، کوئی برچھی و تلوار گرے پڑے زنگ میں بھرے کونے کونٹے سے نکال کر صاف کرنے لگا۔ کوئی آنہ دو آنہ کی بارود لا کر بندوق توڑا دار جھاڑنے لگا کسی بے تمیز نے سر پر ساز و سنگرہ اٹھایا کسی پیادہ پا نے گھوڑا کسوایا پھر تو زبان بریدہ دہانے دریدہ ... یا کاٹنے لگے۔

چلو بھائیو فلانے ساہوکارِ نابکار کو لوٹیں جو سامنا کرے اسے بندوق کے کندوں سے کوٹیں غرض کہ جو کہا وہ کر دکھایا اور دیہاتیوں نے اپنا جدا غدر مچایا صدہا مسافرانِ راہ روانگیٔ ہاتھ سے بے اجل مارے گئے اور ان کے مال و متاع سارے گئے جب یہ کشادہ و بے ہر کس و ناکس کے مشہور بے خوف و خطر ہوئے تب راستہ بند و خلق اللہ مضطر ہوئے۔

یہ حال سیکھ کر پھر آپس میں خوب چھنی اور شب و روز ہونے لگی سینہ زنی۔ بازارِ غارت گری جا بجا گرم ہوا۔ ایک عالم کا پردہ فاش اور بے شرم ہوا، کوئی کسی کی عورت لے کر فرار ہوا کوئی کسی کے مال کا خریدار اور کوئی کسی کا بال بچہ مارنے کو تیار ہوا۔ کسی کی پگڑی کسی کے ہاتھ گئی کسی کی بھینس کسی کے لٹھ کے ساتھ گئی۔ کسی نے کسی کا گھر لاکھ کا ایک دم میں خاک کر دیا اور کسی نے کسی کی زمین و محلات کو اپنے سر پر اٹھا کر دھر لیا۔ خصوصاً پرگنہ باغپت[3] و بڑوت ضلع میرٹھ کا عجیب حال ہوا۔ جاٹوں اور گوجروں کا گھر گھر نہال ہوا اور اس قدر لوٹ چہار طرف سے آئی کہ گھر کو بھر کر پھر چھان چھپر پر بھی جگہ نہ پائی جو کہ ہر دو پرگنہ مذکور الصدر میں بجز دولت خانۂ مسٹر فرانسیس کوئن صاحب کے اور کوئی صاحب رئیسِ اکبر نہ تھا۔ اس واسطے تمامی علاقہ گرد و نواح ہر چندر پور کا جو کہ نمک پروردہ و برگزیدۂ عنایتِ صاحبِ ممدوح تھا، دشمنِ جانی ہو گیا۔ درپئے ایذا رسانی ہو گیا۔ آج خبر آئی کہ موضع کاٹھہ[4] میں جہاں بہت سے لوگ قرض دار صاحبِ مقرالہ کے تھے۔ پنچایت ہزار پانسو آدمیوں کے ہو رہی ہے اسی میں یہ قرار پایا ہے کہ فراسو صاحب بڑے روپیہ والا ہے اور اس کا بول بالا ہے۔ اس کے گاؤں ہر چندر پور پر دہاڑ لے کر شب خون ماریئے اور بعدِ قتل اس کے معہ بال بچہ خزانہ لوٹ کر سدھاریئے اور کل کے روز کسی نے یہ روایت سنائی کہ طرف بڑوت وغیرہ قصبات و دیہات کے ایک غول جاٹوں اور گوجروں کا بہت بڑا بہ ساز و سامان جمع ہو کر گرد و نواح کو ناخت و تاراج کر رہا ہے، ظلم و ستم کا دم بھر رہا ہے اس میں یہ بھی چرچا ہے کہ اس پرگنہ میں فراسو صاحب سونے کی چڑیا ہے اس کے گھر پر فوج لے کر چنگل مارنا چاہئے۔ اس میں توقف نہ لگایئے کہ وہاں سے خزانہ بے شمار ہاتھ آوے گا، ہمارے لشکر کا دلدّر پار ہو جاوے گا۔ ایسے اخبار بہ مضمونِ تازہ و حیرتِ بے اندازہ جب روبرو خاکسار و مسٹر

فرانسیس کوئن صاحبِ عالی وقار گزرتے تب یکایک وہ سرد ہو جاتے۔ با دلِ پر درد فرماتے کہ عزیز و باتمیز و میری عمر کا تو لبریز جام ہو چکا اور داغِ حسرت دل سے دھو چکا ہے۔ مجھ کو اپنے مرنے کا کچھ غم نہیں لیکن تم لوگ اپنی جان کی خیر مناؤ اور اس ماہ میں برائے چندے کہیں چھپ جاؤ شاید اگلے مہینے تک یہ پچھلی بلا دور ہو جاوے اور عملداریٔ سرکار سے پھر روشنی نظر آوے۔ بعد اس نصیحت کے یہ مطلع میاں رجب علی سرور لکھنوی کا حسبِ حال خود ہم لوگوں کو پڑھ کر سناتے۔ مطلع

نسیمِ صبح ہوں یا بوئے گُل یا شمع سوزاں ہوں
میں ہوں جس رنگ میں پیارے غرض دم بھر کا مہماں ہوں

اور کبھی یہ غزل تصنیف اپنی کہ ملک الشعرأ تھے پڑھ کر اطمینانِ بزرگانہ ہم سب کا فرماتے غزل

دردِ پر غم ہے ناتوانی ہے
مرگ کا نام زندگانی ہے
یہ جو دشمنِ غم بناتے ہیں
یہ بھی ایک اپنا دوست جانی ہے
غافل ہم ان سے وہ رہے ہم سے
عمرِ رفتہ کی قدر دانی ہے
سوز دل کس طرح زباں پر آئے
لب ہے خاموش بے زبانی ہے
نظر آجائے گر کمر تیری
ہم یہ سمجھیں کہ غیب دانی ہے
ہے توانائی سے ہمیں بہتر
اب جو یہ اپنی ناتوانی ہے
قصر تعمیہ کر چکے ہیں بہت

منزلِ گور اب بنانی ہے
جس کی الفت میں جی دھڑکتا ہے
اب تلک اس کو بدگمانی ہے
اور یہ بھی ایک غزل فراسو پڑھ
اب یہ ہنگامۂ شعر خوانی ہے

در جواب اس کے بندہ اور برادرم جان کوئن پیش کہ ہر وقت ان کے یمین و تیار و کمر بستہ و با ہتھیار حاضر رہتے تھے۔ یہ عرض کرتے کہ حضرت سلامت آپ ایسا ہراس ہوکر بدحواسی نہ فرمایئے اور خاطر جمع رکھنا چاہئے۔ ہم لوگ مثل رنگ و بوئے گل کے آپ کے ساتھ ہیں بس آپ کے شجر امید سے پتہ توڑ کر کہاں جائیں گے پھر آپ کا پتہ کیونکر پائیں گے اور اپنا زرد روکس کو دکھائیں گے بقول میر صاحب مصرعہ

سنتے ہو میر صاحب گر دم وفا کرے گا
جو حقِ بندگی ہے بندہ ادا کرے گا

اسی گفتگو میں تھے کہ ناگاہ ایک مخبر سے خبرِ تحقیق جوں آوازِ غیب کان میں آئی ساعتِ روح تازہ غالبِ افسردہ میں لائے کہ ایک قافلہ میم لوگ اور صاحب لوگ کا دہلی سے فرار ہوکر بہ حالتِ کشتہ و خستہ موضع کھیکڑا[5] میں افتاں و خیزاں آیا ہے اور کسی جوگی نروگی کے گھر پر اس نے جائے امن پایا ہے۔ یہ سن کر اول تو خوف چند در چند غالب ہوا بعدش دلِ افسردہ اسی پر راغب ہوا کہ جس طرح ممکن ہوان کو یہاں بلایئے اپنی اور ان کے درد کی دوا بنا کر آزمایئے اور ان کی مدد سے اپنا بھی کچھ علاج کرنا چاہئے۔ غرض کہ خفیہ اس جوگی کے پاس زبانی اسی خبر رساں کے پیام بھیجا کہ تم کرپا کر کے اس قافلے کو یہاں تک پہنچا دو اور ہم پر اپنی دیا فرمادو۔ چنانچہ وہ سنتے ہی غنیمت جان کر دوسرے روز علی الصبح ایک چھکڑے میں معرفت زمینداران دیہہ کے سب صاحبان بے سروسامان کو سوار کرا کر ہر چندر پور لایا اور خود بھی اس کے ساتھ با قیام غریب خانہ اپنے بہت اطاعت و خبر گیری سے پیش آیا۔ جس وقت وہ صاحبان مفصلہ ذیل یعنی مسٹر ہیوٹ صاحب بہادر لیفٹننٹ کرنل 38 رجمنٹ بلم تیر مسٹر ولسن

صاحب لیفٹیننٹ توپ خانہ دہلی، مالکیلڈ صاحب انجینئر بارکماستر دہلی، جارج فاریسٹ صاحب لیفٹیننٹ توپ خانہ کمسٹریٹ ومیگزین دہلی، مانگیٹگو پروکٹر صاحب لیفٹیننٹ 38 رجمنٹ دہلی، گمبیر صاحب النیس واجٹین38 رجمنٹ بلم تیر، ای بٹ صاحب لیفٹیننٹ پلٹن مانٹ 54 نمبر، مسٹر مارشل صاحب سوداگر دہلی، مسٹریس فاریسٹ صاحب موصوف معہ تین دخترِ خجستہ اختر مسز کپتان فریزر صاحب انجینیر سفرمین یعنی دختر کرنل فوسٹر صاحب مرحوم مسٹریس بیگلی صاحب، میم کدامی صاحب سرجن معہ یک بابا خوردسال مسٹریس لومیم کدائی صاحب معہ ایک بابا صغیر سن کہ ہمگی 17 آدمی زن و مرد معہ دو بچگان بے چارۂ پریشان وآوارہ تھے، غریب خانۂ کاشانہ میں سترہ مئی 1857ء کوتشریف لائے بہ مجرد ملاقات اور ملانے ہاتھ کے سردست حیرت ہم سب پر چھا گئی وہ بگڑی ہوئی صورت ان کے آنے سے زیالۂ آئینہ دلہائے ناظرین میں سما گئی اور اس وقت کا رنگ ڈھنگ کیا بیان کروں کہ غضب الٰہی ان پر نظر آتا تھا۔ کلیجہ اپنا دیکھ کر منھ سے نکلا جاتا تھا۔ وہ چہرۂ باجمال بے مثال صاحبانِ حمیدہ خصال کہ جس کی ہیبت سے شیر نیستاں فرار ہوتا تھا گرد وغبار میں آلودہ نظر آیا تکلیف پیادہ پائی سفر جان کاہی سے ہوش وحواس باختہ آیا۔ وہ قدم فیض توام ان کا جو اندرون موزہ ہائے سوتی وچرمی رہ کر فرشِ قالین پر پڑتا تھا اس کو آبلہ پائی چرخ نے دکھائی، گُل کی بگڑی خار کی بن آئی، وہ رخِ پُرنور میم صاحبان مجسم حور کہ آفتاب ومہتاب جس کو دیکھ کر آنکھ چراتے تھے گل گلزار کو بھی شرماتے تھے۔ بادِ صرصرِ زمانہ سے پژمردہ وزرد تھی، ہوائیاں اس پر اڑتی تھیں دل سرد تھا وہ قدوم میمنت لزوم ان کا جس کو فرشِ گل پر بھی خوش خرامی سے عار تھی اس کو پیادہ روی وناکامی سے نقیب نوک خار تھی۔ وہ پوشاک رنگارنگ ان کے نیرنگیٔ زمانہ سے مبدل ولباس عریانی ہوئے چرخ نے نیلی پیلی آنکھ دکھائی۔ مصیبت آسمانی ہوئے القصہ یہ صورت وسیرت ان کے دیکھ کر میں نے روبرو اپنے برادر عزیز باتمیز جان کو ان پیش[6] کے یہ مطلع کسی استادِ وقت کا بہ دمِ سرد پڑھا

باغباں ہرگز نہیں تو قدرداں عندلیب
فصلِ گل میں کیوں اجاڑا آشیاں عندلیب

در جواب اس کے عزیز واختر باتمیز نے بھی یہ مطلع کسی اور استاد کا سنا کر تسکینِ دل غمگین میرے کی فرمائی۔ مجھ کو سخن فہمی اس کی اس وقت پسند آئی۔ مطلع ؎

بُلبل کو مکاں ہے نہیں گلشن میں امن کا
نقشہ ہے مبدل جو خزاں سے یہ چمن کا

بات طے کلام مصیبت انجام جب صاحب فرمانے لگے کہ ہم نے آٹھ روز تک موضع کھیکڑا میں بہ خوفِ جاں ایک شکستہ مکان میں گزاراں کر کے سوکھے ٹکڑے کھائے۔ آج تمہارے آ کر کھانہٗ معمولی کھا کر جان میں جان لائے پھر اپنی سرگزشت کہہ کر ہم لوگوں کی حقیقتِ استفسار فرمائی۔ اِدھر اُدھر کی بات برزبان آئی دریں ضمن سب صاحبو نے غسل فرمایا۔ تبدیلِ لباس کا خیال آیا چنانچہ مسٹر فرانسیس کوئن صاحب اور بائی صاحبہ اہلیہ غیر منکوحہ ان کی اور ہم سب لواحقینِ صاحبِ ممدوح نے جو کچھ پارچہ پوشا کی اپنے معہ تھان ہائے ثابت و موجود تھے وہ سب پیش کش ان صاحبان والا سٹان کے فرمائے اور عذر اپنی غریبی کی اُدھر سے بزبان لائے وہ لوگ بہت خوشی سے تبدیلِ پارچہ کر کے مسرور ہوئے ساعتِ افکار دل دور ہوئے بعد اس کے جوان کے جمالِ باکمال پر نگاہ پڑی تو وہ بھی جاہ وجلال ہر ایک کی جبینِ پُرتمکین پر پایا گویا چاند گہن سے نکل آیا۔ بہ مصداق ایں کے کہیں خاک ڈالے سے چھپتا ہے چاند، منجملہٗ اس مجموعہ جو بی ہائے کی مسٹریس فورسسٹ صاحب لیفٹینٹ میگزین مجروح تھیں یعنی ایک ضرب گولی کی ان کے دست پر متصلِ بغل ایسی شدید آئی تھی کہ اس کے زخمِ کاری سے بہت عازی معلوم ہوئیں۔ حتیٰ کہ ان کو غسل سے بھی لحاظ رہا۔ نشستِ برخاست سے اعتراض رہا اور ان کی یہ حالت پر ملالت دیکھ کر انگورِ زخمِ جگر ہم لوگوں کا بھی یکا یک ترق اور اسی دم یہ مطلع حسبِ حال یاد آیا۔ اپنی طرف سے سب کو سنایا ؎

غم کی تپش سے زخمِ جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا
طائرِ دل جو رشتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

میم صاحبہ مجروح فرمانے لگیں کہ بہ اشارہ جب ہم آب غرقاب میں اترا اس زخم پر پانی کا نمک دان کر گیا جانا کہ ہم جیتے ہی جی مرگیا۔ یہ سن کر ہم سب حاضرین کی آنکھوں میں بھی

اشک بھر آئے دل اڈے جی گھبرائے اسی طرح میم صاحبہ کے صاحب نے بھی اپنی آبلہ
پائی کو دکھایا اور ہم لوگوں کو پھوٹ پھوٹ کر رلایا۔ مطلع ؎

آبلے دکھائے جب اس تنِ رنجور نے
دانت میں تنکا لیا خوشۂ انگور نے

غرض بعد تناولِ حاضری شام تک بساطِ رنج والم بچھا رہا۔ ہر یک طرح کا تذکرہ بر
ملا رہا جب آفتاب نے سمتِ مغرب تیاری کی اور مہتاب نے اپنی عملداری کی تب یکا یک
یہ شور وغل آبادیٔ ہر چندر پور کی طرف سے ہوا کہ فوجِ بادشاہی بہ تلاش، صاحبان یہاں آئی
اور ہر چندر پور پہ تباہی لائی۔ یہ خبر کہ آفتِ جان تھی سنتے ہی دل اچھل گیا جی نکل گیا کوئی
صاحب ان میں سے کواڑ کوٹھی اپنے ہاتھ سے بند کرنے لگے اور کوئی شمع گل کر کے اندھیرا
پسند کرنے لگے، کوئی میم جہاں بہ ارادہ بیٹھنے کے کھڑی تھی وہاں نقشِ دیوار ہوگئی اور کوئی جس
جاہ موجود تھی ششدر و لاچار ہوگئی یہ ماجرہ تازہ دیکھ کر خاکسار نے معہ برادر عزیز مسلح ہو کر
گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا اتنے میں بائی صاحبہ ممدوحہ مانع ہو کر فرمانے لگیں کہ تم قدم
آگے نہ بڑھاؤ و دست کو طے کر جاؤ ہم جاتے ہیں اور خبر اس فوج کی لاتے ہیں۔ میں نے
گزارش کیا کہ یہ وقت ہم لوگ کے پسپا ہونے کا نہیں ہے جو درپیش آئے گا از جمال بیش
تصور کیا جائے گا جہاں تک دست و پا یاری دیں گے پنجۂ خوں خواروں سے منھ نہ موڑیں
گے، پیچھا نہ چھوڑیں گے اپنی جان پر گو وبال آجائے مگر ایک بال بھی ان صاحبوں کا دشمن کو
نہ دکھائیں گے حتی المقدور جاں بازی کر جائیں گے ان کو بچائیں گے ورنہ دنیا [illegible]
اپنے گھر پر بلا کر اور آگے دے کر صاحبوں کا سر کٹوایا اب پیٹھ دکھایا یہ کہہ کر موافق اس
طرف کو چلا دیکھتا کیا ہے کہ ایک سوار واقف کار خاکسار آگے آگے چلا آتا ہے پیچھے اس
کے ایک ترپ سواران ہندوستانی نمک خوار سرکار قدم اٹھاتا ہے، نزدیک پہنچ کر اس سوار
نے تبسم فرما کر مجھ کو پہچانا میں نے پڑھا شکرانہ بعد ذالک اس نے قریب آکر اور تسلی دہی
کر کے کہا کہ تم اندیشہ نہ کرو اور ہم تو خیر خواہ تمہارے ملازم سرکار کے ہیں صاحبان وارد ہر چندر پور
لینے آئے ہیں ان کے لئے مدد سواران لائے ہیں۔ یہ خوشخبری فی الفور صاحبان پوشیدہ و تم

رسیدہ کو عاصی نے جا کر سنائی تب ان کے جان میں جان آئی من بعد دو ترپ کوٹھے پر آ کر گھوڑوں سے نیچے اترا اور سرگرمی سفر سے ٹھنڈا ہوا اس میں کپتان گاف و مسٹر مسکڑی صاحب دو افسر بھی تھے کہ ان سے بھی بذریعہ صاحبانِ مہانان بخوبی ملاقات ہوئی۔ عذر کے حکایات ہوئے پھر تو سب صاحب لوگ آپس میں ہاتھ ملا ملا کر اور انگریزی میں باتیں بنا بنا کر نہایت مسرور ہوئے۔ رنج و کلفت دور ہوئی پس ازاں دورِ شراب ناب چلنے لگا ذکر دورِ گردوں کا نکلنے لگا۔ کرنیل نیوٹ صاحب بہادر نے فرمائشِ بئیر شراب کی فرانسیس کوئن صاحب سے کر کے کلیجۂ کپتان گاف صاحب و مسکڑی صاحب مسافرانِ سرگرداں کا بہ نورِ تشریف آوری ان کے تر کیا۔ انہوں نے بھی ادائے شکر سر بسر کیا پھر تو دم بدم جام چکر میں آیا ساقی باقی دیتے دیتے گھبرایا۔ گردشِ چشم کیفیت اپنی دکھانے لگی۔ قلقلِ مینا کچھ ذکر سرور فرمانے لگی۔ اتنے میں تھوڑی دیر بعد شیشہ سرِ محفل بہ یادِ آفاتِ غدر ہچکیاں لے کر رو پڑا کہ اسے دم صحرائی نے اس کا کلیجہ پانی سے ٹھنڈا کر کے نصیحت فرمائی۔ اس نے بہ شکرانہ گردن جھکائی۔ نظم مرزا رفیع السودا ؎

یہ جانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشہ کا
کہ لے کے ہچکیاں.... نکل جاتا ہے شیشہ کا
مشابہ کس کی آنکھوں سے پڑی ہے شکل ساغر کی
کہ خونِ دل اسے پینا نپٹ بھاتا ہے شیشہ کا
نہ جانے یاد کر روتا کس کے دل کے صدمے کو
کہیں ٹکڑا جو سودا تو نظر آتا ہے شیشہ کا

حاصل کلام معہ ناب و یک رنگ نے خوب رنگ اپنا دکھایا۔ رازِ دل سب کا منھ پر آیا۔ کوئی صاحب بہ عالمِ سرور مسرور ہو کر یہ مطلع کسی کا زبانِ مبارک سے فرماتے۔ مطلع ؎

وہ برانڈی تو ساقیا ڈبل کا
کاک اڑتا ہو جس سے بوتل کا

اور کوئی یہ شعرِ سودا پڑھ کر حاضرینِ بزم کو سناتے۔ شعرِ سودا ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

جوکہ جیمس صاحبان مجمع اخلاق ومنبۂ مشفقات تھے۔ سخنانِ شیریں وکلماتِ نمکیں ان کے سے نہایت حظِ زندگانی ومسرتِ روحانی حاصل ہوئی۔ تا نصف شب گل وشرب کا مزہ رہا۔ خوب جلسہ رہا۔ اس عرصہ میں خاکسار کو یہ سوجھی کہ علی الصبح یہ لوگ تشریف فرمائے میرٹھ ہوں گے۔ کچھ ان کے کلامِ فیضِ رقم سے ایسا یادِ بقاً حاصل کیجیئے کہ جو اپنے کام آوے، نتیجۂ نیک دکھاوے۔ چنانچہ پرچہ قرطاس معہ قلم ودوات ان کے روبرو میں نے رکھ کر درخواست کی کہ اگر دو حروف اپنے رونق بخشی کی غریب خانہ پر آپ عنایت فرمادیں تو ہم لوگ احسان اس کا بجالاویں۔ انہوں نے بہت خوشی اور خوش اخلاقی سے فی الفور قلم اٹھا کر ایسا کچھ بہ حق ہم لوگوں کے کلمۂ والخیر ارقام فرمایا کہ خدا کو پسند آیا، مرتبہ خیر خواہی اس کی بدولت سرکارِ دولت مدار سے پایا بہ جلاوی اس کے بعد عمل درامد سرکار چار گاؤں گنجائشی بہ صیغۂ مالگذاری بہت عزت وخاطر داری سے ہم لوگوں کو نواب گورنر جنرل صاحب بہادر نے مرحمت فرمائے اور ہم سب شکر وسپاسِ ابدی بجالائے۔ وہ نوشتہ جیمس صاحبانِ عالیشان کے نوشتۂ الٰہی سے کم نہیں ہیں۔ ہم لوگوں کے پاس موجود بلکہ حرزِ جاں ہیں۔ باعث زندگی ہر خورد وکلاں ہیں۔ واقع 18 رمئی 1857ء کو جب صبح ان کی تشریف بریک سمت میرٹھ تیاری ہوئی عجب حالت ہماری ہوئی۔ تفرقہ ان کا اور زیادہ موجب خفقان ہوا، خاطر پریشان ہوئے، دل حیران ہوا۔ غرض کہ وقت رخصت فرانسس کوئن صاحب نے گاڑی وغیرہ سب اپنی سواریاں ان کو دیدیں اور چاہا کہ چند آدمی بیچ کے بہ حراست معقول مسلح ہوکر ہمراہ رکاب جائیں اور بہ ہوشیاری تمام میرٹھ پہنچا آویں۔ الغرض ازن ماہ مئی ورعایا کا یہ عجب حال ہوا [illegible] لگے، آہیں سرد بھرنے لگے، کوئی پیٹ پکڑ کر دست کو سر [illegible] جانے لگا، کوئی [illegible] کوئی بولا صاحب جی ہے تو جہان ہے آج کل راستے میں خوف جان ہے، [illegible] کی دھوم ہے، تلوار گولی چل رہی ہے، لاشوں کا ہجوم ہے، ہمارا قدم تو میرٹھ کی طرف جانے کو نہیں چلتا ہے بلکہ نام سے دم نکلتا ہے۔ جس طرح ہو اس نوکری سے ہم کو معاف رکھا جاوے

آئندہ جو سرکار کی رائے میں آئے یہ گفتگوئے نمک حراماں سن کر اس وقت سخت حیرت ہوئی۔ مہمانان کے روبرو ندامت ہوئی، باری اللہ تعالیٰ کو بات ہم لوگوں کی رکھنی تھی کہ اتنے میں مسمی خدا بخش نامی ملازم پیرِ زال جہاندیدہ و نمک حلال نے کہ چالیس برس کا نوکر فرانسیس کوئن صاحب کا تھا بیڑہ ہم رکابی جمعی صاحبان کا تا میرٹھ اس وقت صفِ مرداں میں آکر اٹھایا۔ نام سرخروئی کا پایا، جواں مرداں مردِ صورت زنِ سیرت کو شرمایا۔ فوراً تلوار و لاٹھی سے مستعد ہو کر ہم رکاب ہوا پھر تو دل کی دلیری دیکھ دس پانچ آدمی ملازم وغیرہ ملازم از باشندگانِ دیہہ غرقِ عرقِ انفعال ہو کر روبراہ ہوئے۔ صاحبان کے ہمراہ ہوئے۔ اثنائے راہ سے بخیر و خوبی دوسرے روز اس قافلے کو میرٹھ کے دمدمہ میں پہنچایا اور صاحبان نے خدا بخش وغیرہ ہمراہیان اپنے کو موردِ انعام و آفریں کا فرمایا۔

پس ازاں 27 رمئی 1857ء کو مسٹر طامس ہالینڈ صاحب کوارٹر ماسٹر دہلی بہمراہ مام راج نامی ایک جاٹ سکنہ موضع بھلسوا پرگنہ علی پور کے بہ حالتِ مجبوری و تباہی دل خستگی و پیادہ پائی۔ یکا یک ہر چندر پور میں تشریف لائے۔ اسی طرح مراتبِ تعظیم و تکریم و مہمان داری ان کے ساتھ بھی ادا کی اور جو کچھ پوشاک وغیرہ سے ماحضر غریب خانہ میں تھا اس کو انہوں نے بہ دل قبول فرما کر ایک روز و یک شب مقام کیا۔ صعوبتِ سفر سے آرام لیا، ایک زخم خفیف تلوار کا بر پشتِ صاحبِ موصوف تھا۔ کہ اس کی مرہم پٹی ادھر سے بہ خوبی عمل میں آئی۔ صاحب نے تسکین پائی۔ بادشِ صینِ رخصت انہوں نے بھی ایسا سٹوفکیٹ دستخطی اپنا ہم لوگوں کو عنایت فرمایا کہ سب پر فوق لے گیا۔ مزہ نعمتِ غیر مترقبہ کا دے گیا۔ توصیف اخلاقِ حمیدہ و اشفاقِ پسندیدہ صاحبِ ممدوح کے خامۂ بریدہ زبان سے امر محال ہے۔ بلکہ ہر دم ان کی ثنا خوانی میں لال ہے گویا اجلائے فرنگ تھی ان کی خوبیوں کے عجب رنگ تھے۔ فخرِ لندن اگر کہیے تو بجا ہے۔ شہنشاہِ خوبی لکھیے تو روا ہے۔ فردِ ہر دو عالم قیمت خود گفتی نرخ بالا کن کہ ارزاں ہنوز ...... سیل داری ان کی چینِ جبیں سے آشکار تھی۔ بدیں سبب یہ عنایت ایزدمسبب بہت جلد ترقی یاب ہو کر مسٹر یٹ میں عہدۂ نائب جرنیل پایا۔ قلق خلق اللہ کو اپنے فیضِ کرم سے مالا مال فرمایا۔ ان کو بھی بہ سواری یا تیز گام و سراست مردو مان معتمد و

نیک انجام ودمدمۂ میرٹھ پہنچا دیا۔ آج تک رسمِ نامہ و پیام ان کی طرف سے جاری ہے۔ ہمیشہ ان کو یاد ہماری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو چمنِ کائنات میں ہموار و سرسبز و شاداب رکھے۔

ان کی تشریف بری کے بعد 4/جون 1857ء کو ایک صاحب اور بیٹسن صاحب نامی ڈاکٹر جلیل القدر بہ لباسِ جوگیانہ اور وضع رندانہ گلے میں چند مالا، ہاتھ میں تانبے کا پیالہ، کاندھے پر مرگ چھالہ، کرتا و دھوتی سنگسرنی تن پہ سجائے بیراگی بنے بنائے رونق افروز ہوئے۔ ان کی رنگ برنگی باتیں اور بیراگ کا راگ سن کر نہایت حیرت و تعجب ہوا۔ پھر بغور جو دیکھا تو صاحبِ موصوف ہفت زباں ہیں، گویا طوطیٔ ہزار داستاں ہیں۔ ہر علم میں مشاق و ہر زبان میں گفتگو کا اشتیاق فرمانے لگے۔ کہ ہم نے اپنے کو پنڈت کشمیری کی جگہ ظاہر کر کے اس زبان کی بدولت باغیان سے نجات پائی اور کہیں بیراگی بن کر جان بچائی۔ دو پہر تک ان سے بھی لطفِ کلام رہا۔ ہنسنا بولنا، کھانا پینا، بہ تفریح تمام رہا۔ اسی عرصہ میں ایک چٹھی بہ طلب ان کی بمقام موضع رائی لشکر گاہ بائے سرکاری سے آئی کہ اسی وقت اپنی سواری میں آدمی معتمد ہمراہ کر کے لشکر میں ان کو پہنچا دیا۔ انہوں نے پرچۂ مہربانی اپنے کا عنایت کر کے ہم لوگوں کے دلوں کو پرچا لیا۔ گردشِ فلک نا ہنجار کی خوبی اپنے طالع نامدد گار کے پہنچنا خبر صاحبان روندہ میرٹھ کا لشکر باغیان میں ہونا اس شہر تک کا جہاں میں تھا شادئ[7] باغی کے بہ چندر پور پر ہوئی چڑھائی گھر کی ہوئی صفائی نظم ہے

کدھر ہے تو اے ساقی بے خبر
نہ کی لطف کی غم زدوں پر نظر
ہوا حال اوپر کا سب اختتام
مگر غم کا قصہ رہا نا تمام
تپش سے تڑپ سے تو سردی ہم
کہ لکھتا ہوں ہوں چو داستان ام

نالہ نوازان بزم حسرت و یاس و شفتہ جگران قہر و غم حال ان کا یہ رقم کرتے ہیں کہ
جب یہ شہرت ہر چہار طرف سے تا بہ فتح پتی گئی کہ آنسن صاحب نے چند صاحبان

ستم رسیدگانِ دہلی کو بہ پاسِ برادری وقومیت اپنے گھر خفیہ بلایا بعدہٗ اپنے زر وزور رسی ان کو پناہ دے کرتا میرٹھ صحیح و سالم پہنچایا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ پتہ پتہ بوٹا بوٹا باغِ عالم و عالمیان کا دشمنِ جانی صاحب معزالدولہ و وابستگان ان کے کا ہو گیا اور کانٹے ایضا رسانی کے ان کے حق میں بو گیا حتیٰ کہ جو جو زمیندار ورئیس عزت دار برگزیدہ و مورد مزاحم صاحبِ ممدوح کے کہلاتے تھے اور قدیم سے سلامی و انعامی چلے آتے تھے۔ مشورتِ بد کرنے کو تیار ہوئے آمادۂ کارزار ہوئے۔

الٰہی توبہ وہ بھی کیا برا وقت تھا کہ جن کے نام سے قیامت شور مچاتی تھی ملک الموت کی چھاتی بھر آتی تھی۔ گویا اہلِ فرنگ کا لوہا ٹوٹ گیا تھا کہ جو نام ان کا سنتا تھا آتشِ غضب سے جل کر لال ہوا جاتا تھا۔ دردِ جگر تا بہ فلک پہنچاتا تھا۔ خدا اپنے بندوں کو بے آئے لیجاوے مگر ایسا وقت پھر نہ دکھاوے۔ بقول شخصے ؎

ایک دن پہلے ہی دنیا سے اٹھانا ہم کو
یا الٰہی شبِ ہجراں نہ دکھانا ہم کو

غزل۔ مؤلف ؎

جب سے ہے بت کی نظر ہم سے ذرا بگڑی ہوئی
خود بخود ساری خدائی ہے خدا بگڑی ہوئی
آج کل ہم سے جو ہے اس کی رضا بگڑی ہوئی
شاید ہم سے ہی ہماری ہے قضا بگڑی ہوئی
پہلے تو گل کو کھلا کر پھر بتاتی ہے ہوا
چھوڑ دے خو اپنی یہ بادِ صبا بگڑی ہوئی

غزل

اب ......تو بلبل اور گل کے چٹکنے جو لگے
آگئی کچھ اس چمن میں پھر ہوا بگڑی ہوئی

ہو شفا کیونکر مریضِ عشق کو تیرے بھلا
رہتے ہی اس سے دوا اور بھی دی بگڑی ہوئی
آتے ہی فصلِ بہاری ہوگیا دل چاک چاک
تھی طبیعت اس کی کچھ ہم سے سوا بگڑی ہوئی
مارِ گیتی ہیں لگے منھ مارنے با پیچ و تاب
پیش صاحب تم سے بھی زلفِ دتا بگڑی ہوئی

اس ضمن میں مسمی شاہ مل عرف سیاہ مل ایک جاٹ زمیندار نمبر دار موضع بجرول پرگنہ بڑوت ضلع میرٹھ اپنی تیرہ بختی وشامتِ ایام سے یکا یک بیٹھے بیٹھے باغی بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہزار دو ہزار اپنے گرد ونواح کے قندۂ ناتراش سراپا بدمعاش مثل مور ملخ آنہ دال کی بدولت جمع کر کے جا بجا غارت گری کرنے لگا۔ بے سری فوج لے کر از راہِ ناموری پرائے ٹکڑوں پر مرنے لگا۔ آج قابو پا کر اس نے ایک گاؤں لوٹ لیا کل کسی دوسرے گاؤں دھینگ دھوں کرنے اس کو لاٹھیوں سے کوٹ لیا۔ اسی طرح ہر روز جوتی پیزار اس کے گلے کا ہار رہتے ایک روز کرم علی خاں صاحب [8] تحصیلدار بڑوت نے اس کو بلا کر بہت سمجھایا وہ گنوار اپنے جامۂ حماقت سے باہر نکل آیا بعد اس کے خوان تحصیلدار صاحب و تھانہ داران بڑوت و باغپت کا ہو کر بڑوت پر اول دست غارت گری ڈالا، جب تحصیلدار صاحب کو نہ پایا تب اپنا منھ کیا کالا صاحب موصوف کے آدمی جرار و خستی روزگار تھے۔ اس روز مصلحت وقت دیکھ کر قبل آمد فوج اس مردود کے بڑوت سے طرح دے کر باغپت میں تشریف لے آئے۔ اس نے یہ خبر پا کر باغپت کی طاقت و تاراش پر کمر باندھی اور ہر روز زیادہ تر مرنے مارنے پر ہوا باندھی چنانچہ ایک روز گنوار گردی ہمراہ لے کر باغپت کی بھی خوب خاک اڑائی دست برد دونوں ہاتھوں سے ٹھہرائی۔ تحصیلدار موصوف بھی کہ وہاں موجود تھے اور کچھ افواج راجہ صاحب والی جیند از طرف سرکار ہمراہ اپنے رکھتے تھے اس کی بڑت سے سیاہ مل کو پسپا کیا۔ بعدہ اپنی جان کا بچانا بھی مقدم جان کر معہ فوج مذکور پہاڑی کا رستہ لیا۔ حتی المقدور انہوں نے بھی یہاں تک حمایت عملی وخیر سکالی سرکار کی کہ تا اختتام غدر

آمد و رفت پہاڑی کو نہ چھوڑا، دولت خواہی و جاں کاہی سے منہ نہ موڑا۔ انجام کار اس کے جلاوی میں تحصیلدار صاحب نے بڑا مرتبہ معہٗ عطائے دیہات کے سرکار سے پایا پھر چشمۂ فیض و کرم اپنے کو باخلق اللہ جاری فرمایا۔ الا حاصل رفتہ رفتہ خبر تشریف آوری صاحبان کی بمقام ہر چندر پور اور پہنچنا ان کا بہ لشکرگاہ میرٹھ چھاؤنی۔ گوش زدنی اس سیاہ مل کی بھی ہوئی وہ جہنم واصل اس کو ناگوار سمجھ کر ایک روز بہ ارادۂ روانگی دہلی کہ آمد و رفت اس کی پاس باغیان کے اکثر رہتی تھی معہ تنِ چند بدمعاشان ہر چندر پور آیا مگر تاب روبرو آنے کی بہ نظرِ نمک خواری پاس مسٹر فرانسیس کوئن صاحب نہ لایا۔ ان کے گاؤں کی سرحد میں حاضر رہ کر کچھ طمع زر کی کری۔ حاضرینِ خدمت ان کے نے عرض کی کہ سعدی نے فرمایا ہے، گلستاں میں آیا ہے ؎

دہنِ یک بہ لقمہ دوختہ بہ آب

بطورِ صدقہ و خیرات اپنی جان و مال کے کچھ بھجوا دیجئے۔ اس بلا آسیب کو اپنے دشمنوں کے سر سے دفاع فرما دیجئے۔ صاحبِ ممدوح نے فوراً 25 روپیہ اپنے آدمی کے ہاتھ بھیج دئے۔ اس نے ناک بھنویں چڑھا کر لے لئے۔ بہ آں جا کہ شہد ایک دفعہ کا منہ سے لگا برا ہوتا ہے۔ وہ نمک حرام بدستِ یک اس کے چاٹ میں ہونٹ چاٹا کیا ہر چندر پور کی طرف دانت اپنا رکھا کیا۔ چنانچہ یہ خبر ہر روز ہم لوگوں کے کان میں پڑا کرتی دم بدم جان لیا کرتی خواب و خورد حرام رہتا۔ یہی خیال صبح و شام رہتا بقول میر تقی ؎

عشق ہمارے خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر چکا ہے صبح گیا یا شام گیا

اسی شش و پنج میں مجموعۂ رنج ہو گئے تھے کہ ناگاہ موتی نامی سائیس ملازمِ قدیم مرسلہ والدِ ماجد مؤلف کول علی گڑھ سے بہ لباسِ فقیری و حالتِ دلگیری لاٹھی میں خط ان کا بند کر کے واردِ ہر چندر پور ہوا۔ مضمونِ خط و زبانی نامہ بردہ سے یہ پایا کہ وہاں بھی غارت گروں نے مال و متاع سب لوٹ کر کام تمام کو پہنچایا۔ صرف نقدی جان کی بہ ہزارِ جاں کنی اس معبود نے بچائی ہے۔ دیکھئے کل پھر کیا مرضی الٰہی ہے۔ یہ سنتے ہی ہوش و حواس کے

چراغ گل ہوئے دل جلنے لگے جاں کی قل ہوئی۔ میر تقی ؎

تھی خبر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ خبر ہی ودائے طاقت تھی
دل پے کرنے لگا تپیدہ ناز
رنگ چہرے سے کرگیا پرواز

غرض بعد تحریر جوابِ خط مشار الیہ کو رخصت کیا اور زبانی کہہ دیا کہ یہاں بھی یہی حال ہے۔ بال بال دشمن ہو رہا ہے۔ زندگی وبال ہے اگر آفاتِ غدر سے جان بہ سلامت رہ گئی تو کسی روز ملیں گے ورنہ فاتحِ خیر ہماری پڑھنا دمِ صبر و شکر بھرنا۔ جب موتی ملازم ادھر روانہ ہوا ادھر پھر چہار طرف سے پتھر اجل کے آسمان سے پڑنے لگے جو ہمارے سنگ تھے بچھڑنے لگے یعنی بہ وقتِ شام اسی روز یہ خبر پہنچی کہ آج شب کو خیر نہیں ہے۔ لشکرِ سیاہ مل ہر چندر پور پر معہ تلنگانِ نمک حرامان و آوارگان کے چھاپہ مارے گا۔ بارِ سر تن سے اتارے گا۔ یہ مجرد اس خبرِ وحشت اثر کے روح قالب سے پرواز کرگئی، سکتہ کی حالت سب پر گزر گئی۔ آخر بصد قیل و قال یہ قرار پایا کہ ابھی بلا مقابلِ ساعتی موضع پابلہ (ہر چندر پور سے رٹول کی طرف جاتے میں لبِ سڑک یہ گاؤں موجود ہے) دیہہ گوجران کی جنگل میں کہ وہاں کے زمیں داران پر کچھ اطمینان اپنا ہے جاکر پناہ لیجئے اور جان بچانے کی راہ کیجئے۔ یہ سوچ بچار بدرجۂ لاچار کرکے مسٹر فرانسیس کوئن صاحب نے بذاتِ خود ہم سب خورد و کلاں کو معہ زن و بچہ بہ سواریٔ چھکڑا ہمراہ لے کر ادھر کو منہ موڑا اور بائی صاحبہ کو وہیں ہر چندر پور میں حسب استرضائی شان چھوڑا۔ اس وقت کا حال پر ملال کیا بیان کروں کہ قلم اس کی تحریر میں مانند شاخِ بید کے لرزتا ہے کاغذ کا دل دھڑکتا ہے۔ ایک طرف ابر گھرا ہوا کھڑا تھا دوسری طرف آنسو بھی تولا ہوا کھڑا تھا۔ کالی گھٹا دل کو گھٹا رہی تھی۔ شب تار ہم تیرہ بختوں پر چھا رہی تھی کہ اسی حالت میں پانی برسنے پر آیا۔ دل پانی پانی ہو گھبرایا۔ اسی حالتِ پر ملالت میں گھر سے باہر نکلے۔ اثناءٔ راہ میں سب کو گریہ زاری تھی۔ زبان پر شکر تھا دل کو بےقراری تھی۔ مطلع ؎

گھر سے بے گھر ہوئے اور اپنے وطن سے نکلے
حرف شکرے کے ولیکن نہ دہن سے نکلے

پابلہ[9] میں جب قافلہ ہمارا پہنچا تب زمیندار نے بظاہر بہت خاطر داری کر کے گاؤں سے باہر متصل بنے ایک مکان بگڑے ہوئے میں اتارا۔ بجز طابعداری اور کچھ دم نہ مارا۔ الہ تمام شب آنکھ لگنا محال رہا۔ ہم لوگوں کا دم شماری سے خیال رہا، صبح حال واحوالِ زمینداران کا فہم وقیاس سے دگر دوں معلوم ہوا ان کا طور بطورِ مفہوم ہوا کیا معنی کہ بظاہر بحرِ صورتِ طابع دار تھے الہ باطن میں بشک وشبہ گرفتار تھے۔ کوئی آپس میں کہتا تھا کہ ارے بھائیو گوجر کی بستی سے اوجڑ بھلی۔ اگر ابھی خبر آنے فرنگیوں کی ہمارے گاؤں میں تلنگا پائیں گے ہم کو معہ گاؤں خاک میں ملائیں گے، توپ تفنگ سے اڑائیں گے۔ ایک بولا جو اس فرنگی کو دغا دے پھر خدا کو کیا منھ دکھائیں گے۔ سب کی سن کر اور دو ایک گنوار لٹھ مار شطر بے کار بول اٹھے کہ اے کم بختو عقل کے ناخون لے ڈالو۔ زبان کو سنبھالو۔ جب کالے ہمارے گاؤں توپ سے اڑادیں گے تب یہ گورا اور فرنگی کیا ہمیں دہلی کے تخت پر بٹھا دیں گے، بادشاہ بنا دیں گے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ ان کو جہاں سے آئے ہیں سمجھا کر وہیں پہنچاؤ اور اپنا گاؤں بھی کسی طرح بچاؤ۔ یہ ماجرا وسرگوشی زمینداران کی سن کر شیشۂ دل سنگ بہ تدبیر سے اور زیادہ ترچور ہونے لگا۔ زمین سخت آسمان دور ہونے لگا اور یہ خیال آیا کہ اب دیکھئے یہاں سے تقدیرِ بے پیر کدھر کو پھینکتی ہے۔ اس کیچڑ پانی میں کہاں کہاں مٹی خراب ہوئے گی۔ کسی کی جان ضرور کھوئے گی۔ اس واسطے کہ اس بیاباں میں بجز نامِ خدا یار ہے نہ مددگار ہے۔ کوئی دوست نہ غمخوار ہے۔ سب طرف سے آفت کی ماریں خانما آوارہ ہیں توشۂ راہ سوائے غم والم جاں کاہ نہیں ہے اور کوئی رہبر بجز دلِ مصیبت منزل ہمراہ نہیں ہے۔ غزل میر سوز

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں
پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں
اے ساکنانِ دنیا آرام دوگے اک شب
بچھڑا ہوں دوستوں سے گم کردہ کارواں ہوں

ہاں اہلِ بزم میں بھی آؤں پر ایک سن لو
تنہا نہیں ہوں بھائی بہ نالہ و فغاں ہوں
سوراخ و چاک لاکھوں داغوں کے کون گنتے
گلشن دل و جگر ہے گو صورتِ خزاں ہوں
نام و نشانِ یارب رسوا کیا ہے مجھ کو
جی چاہتا ہے حق ہو بے نام و بے نشاں ہوں
سر مانگتا ہے قاتل قاصد شتاب لے جا
ایسی سبک سری پر کاہے کو سرگراں ہوں
قاتل پکارتا ہے ہاں کون کشتنی ہے
کیوں سوز چپ ہے بیٹھا کچھ بول اٹھ نہ ہاں ہوں

جب شکل مقام وصورتِ قیام وہاں بھی نظر نہ آئی تب پھر لاچار پشیمان وخوار ہوکر دوسرے روز اپنا سا منھ لے کر بدستور خانۂ غم کاشانہ میں یعنی ہر چندر پور آئے۔ وہی ناکامی و یاس باختہ حواس ہمراہ لائے اسی طرح چندروز اور بہ نالہ وفغاں دل مضطر وخاطر پریشاں گزرے و گذارے۔ آخر پھر جلاد فلک کی ہم پر ہوئی تیاری۔ پانچ ماہ جولائی 1857ء کو ایک شخص قوم کا برہمن نامعلوم الاسم مرسلہ سیاہ مل باغی ہر چندر پور آیا۔ پیام زر اس کی طرف سے بہ زور لایا۔ سنتے ہی فرانسیس کوئن صاحب نے اس نمک خوار کشف بردار کا وقت اپنی عملداری میں یاد کر کے پیامبر اس کے کو خوب آڑے ہاتھوں لے کر دھمکایا۔ تخت و ست سنایا۔ صاحب موصوف کہ ہمیشہ کے امیر کبیر تھے ضبط غصہ وغضب نہ فرما سکے، برے وقت اور دوست دشمن کو دھیان میں نہ لا سکے۔ اگر سو دو سو روپیہ اور خیرات اپنی جان و مال کی اس فقیر بے تیر کے پاس بہ دستِ پیامبر بہ حراست اپنے آدمی کے بھجوا دیتے تو یہ فلک کی صفائی یوں نظر آتی اور چشم خوں خوار فلک آفت تازہ لا کر کیوں ترچھی ان کو دکھاتے۔ اس واسطے بزرگوں نے یہ مثل کہی ہے کہ اپنے مطلب کے لئے گدھے کو بھی باپ بناتے ہیں۔ دشمن کو برے وقت میں پاس بٹھاتے ہیں بقول حافظ شیراز ؎

آسائشِ دوگیتی تفسیر این دوحرف است
بہ دوستاں تلطف بہ دشمناں مدارا

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ شدنی جسے کہتے ہیں وہ کب ٹلتی ہے براوقت جس کا نام ہے اسے دیکھ زمین دہلتی ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح پر غور اور خوف فرمانا چاہئے کہ مردہ کو زندہ فرماتے تھے۔ زندہ کو ایک دم میں نصائح و پند سے عالمِ بالا دکھاتے تھے مگر جب وہ وقت بہ حکمِ الٰہی آیا تب تکلیفِ جسمانی و روحانی سب کو گوارہ فرمایا اور اول اپنے کو ہلاک کر کے بعدہٗ بر بامِ فلکِ چہارم پہنچایا۔ سوائے اس کے کچھ بن نہ آیا۔ پس اے عاقلو دنیا سرائے فانی ہے، کوئی دن کی زندگانی ہے۔ جاہ وحشمت شان وعزت سب کہانی ہے۔ جو منظورِ خدا ہوتا ہے وہی باالضرور ہوتا ہے۔ انسان تقدیر کے آگے تدبیر مفت کھوتا ہے۔ دیکھو صاحبانِ عالی شان کس قدر فہیم وارسطو زماں تھے کہ اس غدر سے پہلے شیر بکری کے ساتھ پانی پیتا تھا، دہشت سے ان کی دم دبا کر جیتا تھا۔ رستم کا پِتّا زور سے حکم کے نکل آتا تھا۔ دیوِ دانہ کا جی انگریز کی توپ تفنگ کے نام سے دہل جاتا تھا جب شدنی کا دورہ تھوڑے دن کو آیا اس نے یہ دورِ بے طور دکھایا۔ خونِ ناحق سے باغیوں نے زمین سرخ کی آسمان سیاہ پایا ؎

دنیا ایک زالِ بے سوا ہے
بے مہر و وفا یہ بے حیا ہے
مردوں کے لئے یہ زن ہے رہزن
دنیا کی عدو بھی دین کی دشمن
رہتی نہیں ایک جا یہ جم کر
پھرتی ہے بہ رنگِ مرد گھر گھر

جس وقت اس زنا دار پیامبر سیاہ مل جفا کار نے فرانسیس کوئن صاحب کے قہر وغضب سے نظر بدلی دیکھی اس کا ہاتھ پاؤں پھول گیا، طلب زر کی بھول گیا۔ اپنے ناک کان بچا کے بھوکا پیاسہ ہو کے نراش پاس سیاہ مل کے پہنچا۔ جو جو صلواۃ سنی تھیں ان کو خوب نمک مرچ سے تیز کر کے اس کے گوش تک پہنچائیں۔ ایک کی سو لگائیں۔ وہ کوتاہ اندیش جفا کیش

آتشِ قہر سے جل بھن کر خاک ہوگیا جگر اس کا چاک ہوگیا۔ آخر کار آمدۂ کارزار ہوا ہر چندر پور کے اوپر طاقت لانے کو تیار ہوا کہ یہ خبر 14 رجولائی 1857ء کو ایک معتمد سے پاس خاکسار کے پہونچی۔ خدا اس مخبر کا دین و دنیا میں بھلا کرے کہ جس نے کارِ مسیحائی ہم لوگ غم دیدہ جاں بلبِ رسیدہ کے حق میں فرمایا۔ گویائی تیر سے جلایا ورنہ ایک متنفس بھی ہماری قوم کا پنجۂ خوں ریز ظالمان سے باقی نہ رہتا۔ خونِ ناحق سب کا زمین پر بہتا۔ اس خبر کے سنتے ہی یہی صلاح قرار پائی۔ اسلحہ کے اب تن بہ تقدیر و رضائے قادرِ تدبیر پر کمر مضبوط باندھ کر سب عزیز اسی وقت میرٹھ جاکر امن پاویں اور فرانسیس کوئن صاحب معہ بائی صاحبہ بہ دولت خانہ قیام فرماویں۔ خاکسار نے دست بستہ عرض کیا کہ ہم عزیزوں کا روسیاہ نہ فرمائیے۔ آپ کو بھی بالاتفاق سب کے تشریف لے چلنا چاہیے ورنہ دنیا کہے گی کہ بزرگوں کو چھوڑ کر خوردوں نے اپنی قدح کی خیر منائی۔ اپنی جان بچا کر ان کو صورتِ اجل دکھائی۔ یہ معروضہ ان کے خیالِ محال میں نہ سمایا آخرش سب کو روانہ میرٹھ فرمایا۔ آپ دونوں بزرگوں نے معہ ملازمان اپنے ہر چندر پور میں دل بہلایا۔

قصہ کوتاہ بتاریخ 15 رجولائی 1857ء کو صبح قافلہ ہم سب بے سروسامانوں کا کہ اس میں یہ مؤلف و خاکسار و برادرِ عزیز جان کوئن پیش مستعد بسیار اور ہم دونوں کی میم صاحبہ معہ ایک صبیحہ صغیر سن برادر مسطور و تنِ چند دایا و ملازمان خدمت ہمگی بیس آدمی بکار خود ہوشیار تھے مگر آفات الارضی و سماوی سے حیران و دل افگار تھے۔ یہ سواری چھکڑا صورت بدل کر اپنی سیرت سے باہر نکل کر عازم میرٹھ ہوئے۔ اس وقت مسمّی سیتارام زمیندار و شجاع و جرار سے دوست و طابع دار از فرانسیس کوئن صاحب و مسکنہ موضع جسی پرگنہ باغپت کا تھا [illegible] ہمارے ہمراہ ہوا۔ باعث تسکین غم جاں کاہ ہوا۔ اس کی شرافت و جرأت کی ثنا خامہ و زبان سے آشکال ہے۔ وہ ایسا ہی اپنی قوم میں یک رنگ و بے مثال ہے۔ اثنائے راہ میں [illegible] پر آگے آگے نگاہ تھی پیچھے اس کے دل سرد سے اٹھتی ایک آہ تھی۔ ہر قدم پر خدا پر نظر رہی۔ ہوش باختہ تن بدن کی کس کو خبر رہی۔ جو قدم قافلے کا آگے بڑھتا تھا خیال باغیان و خوف سراغیان سے پیچھے پڑتا تھا اور اس ایام میں موسم برشکال عجب احوال تھا کہ شب و روز ابر کو

برسنے سے کام تھا، کھلنے کا کون لیتا نام تھا۔ چارطرف اس روز گھٹا چھا رہی تھی بجلی چمک چمکا کر جان و دل گھٹا رہی تھی۔ دریا بڑے زور و شور سے چڑھ رہے تھے۔ مسافروں کے چہرے اتر رہے تھے۔ ندی و نالہ ہر طرف شور و نالہ کرتے تھے۔ دل بادل کی نظر بدلی دیکھ کر ڈرتے تھے۔ پپیہا کوئل کے ہمراہ پی پی کہتا جاتا تھا۔ باغبانِ حقیقی اس کے چھپٹوں میں کب آتا تھا۔ انجام کو بھگتے بھاگتے نشیب و فراز دیکھنے بھاتے۔ اپنے کو سنبھالتی ندی، ہنڈن پر متصل موضع بالینی[10] (جانی بالینی، میرٹھ۔ باغپت روڈ پر گاؤں) دیہہ اہیران پہونچے۔ طغیانی اس کی کا گر بیان کروں تو قلم و کاغذ ہاتھ سے چھٹ کر بہا جاتا ہے، کہیں کوزے میں دریا سماتا ہے۔ اس کی لہریں دیکھ کر جواں مردوں کی جوانی کی موجیں غوطہ کھاتی تھیں۔ شناورِ دن کی چھاتیاں بھر بھر آتی تھیں کوسوں تک نظر جاتی تھی ساحل کا سینہ نہ پاتی تھی۔ علاوہ اس کے کشتی و ڈونگا کا اس میں نام و نشان نظر نہ آیا۔ باغیوں نے سب جلا کر خاک میں ملایا۔ صرف ایک چارپائی شکستہ کو چار سبو چے گلی پر بستہ پایا۔ یہ نقشہ وہاں کا دیکھ کر سب نقشہ قافلے کا بگڑ گیا دریائے اشک ذورقِ چشم میں بھر گیا۔ میر حسن یہ کہہ کر وہ اس طرح غش کر گیا کہے تو کہہ جیتے ہی جی مر گیا۔ کسی کی ہمت نے پار جانے کو گوارہ نہ کیا۔ بلکہ سب نے دور رہنے کا چارہ کیا۔ کوئی بے چارہ اس وقت بولا کہ کالوں کے ہاتھ سے ایک روز مرنا ضرور ہے، لیکن اس بحرِ ذخار میں قدم رکھنا نہیں منظور ہے۔ کوئی یہ بند اس وقت بیانِ جرأت کے پڑھ کر رونے لگا کوئی پانی پانی ہو کر گوہرِ جاں کو کھونے لگا۔ نظم ؎

یا رب اندوہ جدائی سے تو مرنا بہتر
دل پہ غم گزرے تو بس دل سے گزرنا بہتر
بحر الفت میں قدم کا نہیں دھرنا بہتر
کہ کنارہ ہی اب اس حال سے کرنا بہتر
رفتہ رفتہ وہ ہوئے پنجۂ آفت میں غریق
موجزن دل میں ہوا جن کے یہ دریائے عمیق

قیس و فرہاد سے اس بحر میں لاکھوں پیراک
آہ کیا جانے کہ وہ بہہ گئے مثلِ خاشاک
آشنا ہم جو صدف اس سے کوئی کیا ہوئی خاک
حاصلِ ربط یہی ہے کہ جگر ہوئے چاک
اس سے جوں موجِ رواں جس کو بڑھا الجھیڑا
نہ ملا پر نہ ملا اس کا کہیں تھل بیڑا

آخرالامر سیتارام زمیندار کہ آدمی دریادل و جہاندیدۂ بسیار تھا کہنے لگا کہ صاحبو مجھ کو آپ کی فرمانبرداری سے کچھ عذر نہیں ہے مگر عرضِ بے غرض میری مانو تو اس جگہ کی قیام کی ہرگز دل میں نہ ٹھانو۔ کس واسطے کہ یہ جنگل اور ویرانہ ہے یہاں اپنا نہ بیگانہ ہے۔ صرف یہ گاؤں اقوام اہیر بے پیر کا نظر آتا ہے سوان لوگوں کا بھی کیا اعتبار ہے بلکہ ایک زمانہ تمہارا دشمن لیل و نہار ہے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ اس چارپائی موسوم بہ گنہائی پر قدم امید رکھ کر بنام خدا تدبیر عبور فرمائیں اور دل کو مضبوط رکھنا چاہئے۔ خدائے تعالیٰ اپنی قدرت سے ناخدائی دست گیری سے تمہارا بیڑہ جلد پار لگا دے گا، کشتی مراد کو ساحل خیریت پر پہنچا دے گا۔ اس زمیندار سے یہ سنتے ہی پھر تو سب قافلے کو جائے کلام نہ رہ کر ایک ہمت باندھ لی کہ رفتہ رفتہ اسی روز شام تک جملہ خورد و کلاں عبور ہوئے۔ ساعت رنج و کلفت دل سے دور ہوئے۔ پھر سب نے ساحل مراد پر پہونچ کر اور خیال کو اس وقت درکنار رکھ کر اول دوگانہ شکرانہ اس معبود کا ادا فرمایا گویا آب رفتہ بجو آیا۔ غرض اس شب و تھوڑی دور ندی سے آگے بڑھ کر جو فرش زمیں سب نے پسند کیا۔ صبح وہاں سے پاؤں اٹھا کر میرٹھ میں گزر کیا۔ راستے میں جو صورت اللہ کا کرم رہا مگر خوف باغیان بہ قدم رہا۔ میرٹھ میں ممداری [illegible] کرتی میں جی آیا اور چھاؤنی میں جو کوٹھی ایک دوست کی خالی پڑی تھی قیام [illegible] تیسرے روز پاس اس قافلے کے خبر پہونچی کہ [illegible] ماہ جولائی 1857 [illegible] دہقانی و تین چند تلنگان فوج ہندوستانی نے چندر پور پر چڑھ آیا۔ [illegible] کو خوب لٹوایا۔ بعد صاحب موصوف [illegible]

کر کے معۂ بائی صاحبہ بضر باتِ چابک و بیت بہت مارا اور ان کو بجز نالہ و آہ نہ رہا چارہ۔ تلنگانِ بے ایمان کا یہی سوال تھا کہ خزانہ بتاؤ اپنا جی چھڑاؤ ورنہ پیمانۂ اجل تم کو پلائیں گے کام تمام کر جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ سارا گھر ہمارا تمہارے حوالے ہے جہاں پاؤ کھود کر خزانہ لے جاؤ اور ہم کو مضروب کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ ایسا تیغ بے دریغ سے مارو کہ جلد ہمارا کام ہو، تمہارا نام ہو، جو کہ بے حکمِ حاکمِ حقیقی ایک برگ کو جنبش نہیں ہو سکتی۔ نظر بر آں اس حافظِ مطلق نے دستِ خوں ریز ان سفا کان نے بے رحم کا کوتاہ فرمایا اور جانِ ناتواں دونوں صاحبوں کو بہ حفظ و امان رکھ کر مال و متاع کو بعوض اس کے لٹوایا۔ سبحان اللہ کیا شان اس خالقِ جہاں عالیشان کی ہے کہ بے اشارہ اس کے پرندہ پر نہیں مار سکتا ہے، ملک الموت اجل کا نام لے کر نہیں پکار سکتا ہے۔ ہنگامۂ توپ تفنگ میں جن کی آئی وہی جاتے ہیں، باقی صاف نکل آتے ہیں۔ شعر

من چراگر بہ کم از نہ دہ رمی بخت
بے رضائے تو یکی برگ نہ چند زورخت
(اللہ کی رضا کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا)

حاصلِ مدعا اس طرح ہنگامۂ غارت گری بسیار روز و درب بے شمار شام تک برپا رہا۔ آسمان و زمین تہہ و بالا رہا۔ اس میں دونوں صاحبِ مسبوق الذکر نے تکلیفِ ضربات سے بوجہ پیری و ناتوانی بہت صدماتِ جسمانی اٹھائے کہ ایک مہینہ میں بہ حالتِ اصلی در آئے اور مسمّی عظیم الدین ملازمِ قدیم صاحبِ ممدوح بجبر یہ شمشیر اس معرکہ میں مجروح ہو کر شرطِ خیر خواہی بجا لایا اور اس سے زیادہ خدا بخش دوسرا ملازمِ دیرینہ صاف سینہ بروقت گرفتاری اپنے آقا نعمت کی تلوار لے کر سامنے باغیان کے آیا مگر موقعہ حرب زنی نہ پایا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ جلّ شانہو نے دونوں کو نمک حلال اور خیر خواہ مالکِ خوش اقبال دیکھ کر اپنے فضل و کرم و خوش نیتی آقائے اعلیٰ پیہم سے ان کی جان ہاتھِ ظالمان سے بچائی۔ خلق اللہ کی زبان سے دونوں ہوا خواہ کی واہ واہ سننے میں آئی۔ بعد اس کے سیاہ ل تمامی گھر فرانسیس کوئن صاحب کا خالی کر کے اور سب اسباب تخمینۂ دس ہزار روپیہ کا ان کے چھکڑے میں بھر کر دونوں صاحبوں کو

بہ صورت نظر بندی ہمراہ اپنے لشکر کے موضع نبالی[11] دیہہ گوجران میں لے گیا۔ اس کے عوض میں داغ ابدی صاحب کو دے گیا۔ وہاں جا کر تمام شب دونوں صاحبوں کو بہ طلبِ زر نظر بند رکھا صبح کو جب مسمّی گڈھیرا ابقال موضع میتلی[12] نے پانچ سو روپیہ نقد صاحب کی طرف سے بطورِ قرض ادا کر کے فیصلہ کرایا تب پنجہ اس ظالم سے جان بچا کر چھڑایا ورنہ خدا جانے وہ بدکیش آگے کو کس طرح صاحب کے ساتھ پیش آتا اور کیا آفت تازہ دکھاتا۔ اللہ تعالیٰ اس بنیئے کا بھلا کرے کہ جو ایسے برے وقت میں اس سے یہ حرکت عمدہ بن آئی۔ دین و دنیا میں اس نے عزت و حرمت پائی بقول آنکہ جائے لاکھ رہے ساکھ۔ الغرض بعد اس معاملے کے سیاہ مل کا معہ لشکر اپنے گھر کی طرف جانا ہوا اور دونوں صاحبوں کا افتاں و خیزاں ہرچندر پور کو آنا ہوا۔

گھر پر آ کر جو دیکھا تو بجز گرد و غبار گنوار گردی کے اور خاک نہ پایا۔ نقد و اسباب کا نام و نشان نظر نہ آیا۔ آخرش مانند تہی دستان قسمت کی کف افسوس ملا کیئے۔ اس کی رضا پر راضی ہو کر صبر و شکر ادا کیئے۔ بر آں جا کہ چاہ کنندہ راہ چاہ درپیش مشہور ہے اور قول بزرگاں تاثیر رکھتا ضرور ہے۔ نظر بر آں تیسرے روز اس وقوع سے پیمانہ عمر اس سیاہ مل کا یک بیک بھر گیا گویا قسمت کا لکھا پورا کر گیا۔ یعنی فوج انگریز نے کہ شب و روز متلاشی اس کے رہتے تھے، بمقام موضع پواڑی و بڑکہ[13] پہنچ کر سر اس کا تن سے جدا فرمایا۔ جہنم میں اس کو دست بدست پہونچایا اور اس کے لشکر کو خوب توپ و تفنگ سے اڑایا کہ اس فتح و جنگ کی بعد اس نواح میں ذرا امن ہوا۔ خلق اللہ کا دور رنج و محن ہوا۔ فرانسیس کو ان صاحب نے بھی سن کر عیوض اپنا درِ حق سے پایا شکر فراوان موودی فرمایا۔ بقول شنیدے کہ بود ۔ نیات خوش ۔ ۔ سرگزشت مفصل ہم لوگوں کے پاس بذریعہ خط صاحب مغفر اللہ پانچویں روز ... پہونچی کہ سن کر شکر و سپاس حمد بے قیاس خداوندی اس خداوند ... جان بخشی ... صاحبان کے سے بجا لائے اور مال و متاع کو صدقہ جان ناتوان ... صاحب کا ... مراد سلامتی ان کی بہ کف مقصود پائے اور مزید برآں یہ بھی اغنیمت جانا اور اس کی قدر ... پہچانا کہ اگر دو روز آگے قافلہ عزیزان صاحب مغتنم اللہ کا ہرچندر پور سے فرار ...

آتا تو پنجۂ خوں خوارِ سیاہ مل وہمرایان اس کے سے بے آئے ملکِ عدم کو جاتا۔ اس ضمن میں ایک اور خدنگ کاری قوسِ فرخ فلک کے ستم گاری سے اوپر سینۂ فگار ودل زار ہم لوگوں کے پہونچا کہ زخم جس کا اب تک روبہ اندمال نہیں لایا بلکہ تمام عمر کا ناسورِ جگر قسمت نے دکھایا یعنی آخر ماہِ جولائی 1857ء کو پھروہی موتی سائیس مذکورہ بالا مرسلہ والدِ ماجدِ خاکسار مقام علی گڑھ سے بہ حالتِ گداگری میرٹھ میں متلاشی ہم لوگوں کا آیا اور خبر حادثۂ جاں کاہ انتقالِ ہمشیرہ عزیز مؤلف کے جو کہ ہمراہ جیمس گارڈنر صاحب کہ رئیس کاسگنج[14] نبیرۂ کرنیل گارڈنر صاحب مرحوم منسوب ہوئیں تھیں بقضائے الٰہی بذریعہ پرچہ کاغذ کے لایا کہ باہو مجرد استماع کلیجہ منھ سے نکل گیا۔ جی دہل گیا۔ اپنے رنج وغم کی حقیقت بھول گئے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے، چاہا کہ زمیں شق ہو اور اس میں سما جاویں۔ زندگی سے ہاتھ اٹھاویں لیکن سخت جانی کی بدولت سنگِ صبر سینے پر رکھ کر جیتے رہے۔ زخمِ جگر کو تارِ رگِ جاں سے سیتے رہے۔ مشہدی ؎

دل کے جانے کا مشہدی حادثہ ایسا نہیں
جو نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کیے

بعد ازاں ہمارا حال حالِ شکستہ بال دیکھ کر موتی مستور کا ادھر جانا ہوا اور ادھر مسٹر فرانسیس کوئن صاحب کا ہر چندر پور سے ہاتھ اٹھا کر باستثنائے بائی صاحبہ[15] میرٹھ میں آنا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے تمام سرگزشت اپنے عزیزان کی آگے تمام کر کے تا فتح دہلی میرٹھ میں قیام کیا اور سب عزیزان نے ان کے زیرِ سایہ چندے آرام کیا۔ شعر ؎

یہاں کا تو قصہ میں چھوڑا یہاں
اب آگے سنو دوسری داستاں

داستانِ غارت گری خانۂ غم کاشانۂ جان پیش صاحب والدِ مؤلف بعد تباہی وہزار جاں کاہی خدا خدا کر کے جان بچانا معہ اہل وعیال واطفال دور از وطن ہو جانا۔ مصیبت نگار ومصائب رقم ؎

جگر چاک و مغموم میرا قلم
زمانہ کے کچھ طرز لکھتا ہے یاں
عجائب غرائب ہے یہ داستاں

یہاں سے دشت نوردان وادیٔ سخن جگر افگار و غربت زدگان بہ رنج و محن و دلِ داغ دار صفحۂ قرطاس پر یوں رقم زن ہیں کہ جناب جان پیش صاحب [16] قبلہ و کعبہ مؤلف ابتدا طول عمر اپنی سے بہ مقام شہر کول ضلع علی گڑھ ساتھ ایسی وضع داری و خاکساری کے بسر اوقات اپنی کرتے تھے کہ جناب باری ان سے راضی تھا۔ وہ اس کے فضل و کرم کا دم بھرتے تھے۔ تمام روسائے شہر و ضلع ان کے حال پر عنایت فرماتے تھے وہ سب سے رکھتے ملت و فا تھے۔ ان کے رویے و خوش طریقہ کو دیکھ کر دوست دشمن ثنا خواں تھا۔ ادنیٰ و اعلیٰ خوش و خرم بے گمان تھا۔ کسی کی زبان سے محمد شاہ وقت کہلاتے تھے۔ کسی کے بیان سے لکھ پتی سنے جاتے تھے۔ البتہ ہم میں روپیہ و دولت کی طرف سے خدا کا نام تھا صرف اسی کی قدرت و کرم کی بدولت ان کا چلا جاتا کام تھا۔ ہاں البتہ واسطے شکم پروری و اعیال داری کے کچھ جزوی شغل دادستہ جاری رکھتے تھے کہ اس نظر سے بہت آدمی وہاں کے ان کے قرض دار تھے۔ ہوا خواہ بسیار تھے۔ اس طرح مدت تک مسبب الاسباب نے ان کی بہ آبرو گزاری بہر صورت رکھی۔ بالفعل جناب باری جب کہ زمانے کی ہوا یک بیک بدل گئی و پاس غدری اڑانے لگی تب بعض دوستوں خاص ان کے نے کہا کہ صاحب دریں والا آب و ہوا اور بے چھٹنے دانے پانی کا طور ہے۔ آپ بھی فکر اپنی فرمایئے بساط انبساط اپنے گوشے کرنا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا کہ صاحبو۔ میرے پاس بجز نام خدا اور کیا ہے جو کوئی لے جائے گا۔ مجھ کو اس کا افسوس آتا ہے کہ علاوہ اس کے میری غریبی پر ایک زمانے کی نگاہ ہے [illegible] اس ضلع میں [illegible] رسم و راہ ہے اور مجھ سے آج تک کسی و زندگی کی [illegible] کا نہیں پہنچا ہے یقین ہے کہ [illegible] کوئی نہیں ستاوے گا۔ بہ حتی المقدور [illegible] شریف ان سے [illegible] گزرا کہ چرخ کج رفتار ایک دم میں رنگ اپنا بدل جاتا ہے۔ [illegible]

شعر

غنیمت جان لے یہ صحبتیں آپس کی اے ناداں
دگرگوں حال ہو جاتا ہے اک دم میں زمانے کا

آخر کو جب میرٹھ سے ہوائے گرم شور و فساد کی چلتی ہوئی علی گڑھ میں آندھی کی طرح پہونچی تب وہاں کے لوگوں کے دل سرد ہونے لگے۔ حواسِ خمسہ کھونے لگے۔ جانا کہ کچھ بدمعاشان کا زور ہے سو وہ سرکار سے سزا پائیں گے۔ سرنگوں ہو جائیں گے انجام کو اسی وہم و گمان میں ایک دم و ایک آن میں 20 ماہ مئی 1857ء کو اس طرح کا شورِ قیامت بہ ملامت کالوں کی جانب سے اوٹھ کر علی گڑھ میں برپا ہوا کہ ایک ساعت میں کسی نے کسی کو نہ پہچانا۔ دوست دشمن ہوئے اپنا ہوا بیگانہ۔ اول تلاشِ صاحبانِ والا دودمانِ کرسی کوئی روبرو نہ آیا۔ سب نے قبل آمد ان کی جہاں جگہ پائی اپنے کو چھپایا۔ من بعد باغیان نے معہ مردمانِ شہر خزانۂ سرکاری پر ہاتھ ڈالا روپیہ کے توڑوں کو گلے کا ہار بنا کر گھر کا راستہ سنبھالا، یہاں تک روپیہ کا مینھ برسایا کہ کھوٹا کھرا سارا شہر لوٹنے کو آیا۔ جو مفلس تھا وہ تونگر و زردار ہوا۔ بے بال پر تھا پردار ہو کر اڑنے کو تیار ہوا جس کی ذات میں محتاجگی سے بٹہ لگ رہا تھا وہ سونے کی طرح نکھر کر سرخرو ہو گیا اور جس کی چاندی پر جنم سے بال نہ تھے وہ سر بسر سفید پوش ہو کر دوبدو ہو گیا۔ جو تھوڑی سی فوج سرکاری کہ ہمیشہ سے علی گڑھ میں رہتی تھی وہ بھی بے سری ہو کر ہم جنسیوں میں شامل ہوئی۔ نمک حرامی سے جیتے جی جہنم واصل ہوئی پھر تمام شہر کے بدمعاشوں اور اچکوں کی گویا روزی کھل کر روز بروز ہمراہِ فوجِ باغی جو ادھر ادھر سے براہِ علی گڑھ گزرنے لگی، ہاتھ غارت گری کے صاف کرنے لگی۔ اپنے خالی گھروں کو مال و اسباب سے بھرنے لگی۔ آج بے دھڑک ہو کر اس بازار میں ہاتھ ڈالا کل سینہ سپر بن کر اس کنج میں گنجِ ساہوکاروں کا لوٹ کر دیوالا نکالا۔ جو کوئی اکیلا دوکیلا گلی کوچے میں نظر آیا اسے لوٹ لاٹ کر راستہ بنایا۔ جس کی جس سے عداوت تھی اس نے اس کو بے دریغ ہلاک کیا قصہ قضیہ پاک کیا۔ الا حاصل اس طرح 20 / مئی سے 7 / جون 1857ء تک یہی شور و شر رہا۔ زمانہ کا حال زیر وزبر رہا۔ آٹھ ماہ مذکور کو بلا پس و پیش رفتہ رفتہ بدمستگانِ شہر نے باغیوں کو پتہ ونشان مکان جان پیش صاحب کا بھی بتایا اور خیال ان کا زبان پر آیا۔ صاحبِ ممدوح نے کہ

اپنے قول پر قائم تھے ہنگامۂ رستخیز سن کر تاب گھر سے باہر نکلنے کی نہ پائی نہ کوئی تدبیر کسی جاں مخفی ہونے کی بنائی صرف اپنے غریب خانہ میں معہ اہل وعیال و اطفال دروازہ بند کر کے دن کو بشکر باری ورات کو بہ ستارہ شماری بسر کرتے رہے۔ آخرش جب وہ وقت برا آیا پھر کسی کو ساتھ اپنے بھلا نہ پایا۔ جو کہ صاحب کے قرض دار تھے وہی مال ان کا مارنے کو تیار تھے۔ جو لوگ کہ صاحب کے ہر روز سلامی تھے وہ ایک دم میں دشمنِ دوامی ہوئے، فوجِ باغی سے ہم کلامی ہوئے۔ جس نے کہ صاحب کا نمک طولِ عمر سے کھایا تھا اس نے ان کے نام پر ایسا کھٹا کھایا کہ جو کوئی باغی صاحب کے مکان کا راستہ بھول چوک گیا تو اس کو اپنی طرف سے پتہ بتایا۔ حقِ نمک خواری جتایا جس کا کام صاحب کی نظرِ پرورش سے بنتا تھا وہ نا کام بگڑ کے ان کا دشمنِ جانی ہوا۔ عجب انقلابِ آسمانی ہوا جس کو ڈھونڈھا صاف چکنا گھڑا پایا۔ گویا ان تلوؤں میں تیل نظر نہ آیا۔ غزل مؤلف ؎

جب سے نظر بتوں کی یہ ہم سے خدا پھری
دشمن پھرا و دوست پھرا اور وفا پھری

آکر تری سواری جو اے دل ربا پھری
شاید ادھر کی آج اُدھر کو ہوا پھری

پھیری جو آنکھ اس بت میکش نے بزم میں
ساقی پھرا و شیشہ پھرا اور صبا پھری

دروازہ کیا قبول کا واں بند ہو گیا
الٹی فلک سے آج جو اپنی دعا پھری

چکر میں تیرے آکے فلک پھرتی ہوا
موسم پھرا زمانہ پھرا اور ہوا پھری

تیری نظر پھرے تو خدایا سب سے پھری
دنیا پھری و دین پھرا اور رضا پھری

اللہ رے الاغری تیرا احسان رہ گیا

بستر پہ مجھ کو ڈھونڈھ کے الٹی قضا پھری
غنچہ کو پہلے گل کیا پھر اس کو داغ دے دیا
گلشن میں کیا کیا رنگ دکھاتی صبا پھری
کوئی پھرا نہ گورِ غریباں پہ بعدِ مرگ
ہاں کچھ پھری تو خاک اڑاتی ہوا پھری
میں نے کہا جو مار تو منھ مارنے لگے
بل کھا کے اس پہ مجھ سے وہ زلفِ دتا پھری
پھیر اپنی قسمتوں کا کہاں تک لکھوگے پیش
حاکم پھرا وہ حکم پھرا اور بلا پھری

اسی سوچ وچار میں لاچار تھے کہ صبح آٹھ بجے 8/جون 1857ء کو صاحب معہ عیال واطفال اپنی حاضری تناول فرما رہے تھے۔ یہی ذکر گردونِ دون کا زبان پر لا رہے تھے یکا یک عبداللہ نامی خانہ زاد نے آ کر رپورٹ دی کہ صاحب باغی دروازے پر آ گئے چہار طرف سے وہ روسیاہ مانندِ تاریکی چھا گئے۔ یہ سنتے ہی وہ کھانا خونِ جگر کے کھانے سے زیادہ نظر آیا۔ سمِ قاتل کا مزہ اسی میں پایا۔ طائرِ روح حاضرین کو جو حاضری پر موجود تھے ہاتھ پاؤں پھول گئے، آب ودانہ بھول گئے، بہ ہزار دشواری بالائے بام اپنے کو پہنچایا اس طرح جان کو بچایا۔ اتنے میں تنِ چند مفسدان نے مکان مردانے میں درآمد ہو کر بہ کشادہ پیشانی اول اسپ سواری وبگھی وغیرہ اسباب پر جو محاذ ان کے آیا ہاتھ ڈال کر اپنا منھ موڑ لیا۔ باقی کو دوسرے وقت پر چھوڑ دیا بعد دفعیہ اس بلا کے صاحب بالائے بام سے نیچے تشریف لائے۔ ساعت اس شکر کے ادا کرنے میں نہ گزرنے پائے کہ مکرر وہی عبداللہ دوسری رپٹ پیامِ اجل کی لایا۔ اس نے ہوش وحواس کو بھلایا۔ یعنی بعد دو گھنٹہ پھر چند اشخاص مسلح از باشندگانِ شہر وفوج تا صحنِ کا خانہ مکانِ مردانہ جوق در جوق کر کے شور قیامت ہمراہ لائے اور جو کچھ اسباب دوبارہ ہاتھ آیا لے کر چلتے پھرتے نظر آئے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی صاحب نے اسی جگہ امانِ جان پایا جو اوپر بہ نوکِ خامہ درآیا۔ بہ مرتبۂ ثالث اسی روز واللہ عالم کس عدوئے

جانی مخبرِ لاثانی نے ایسے کچھ کان ان حملہ آوران کے بھرے کہ پھر تو وہ تھے مقرِ بہ ارادۂ صفائی خانہ ہمراہ ایک زمانۂ تشنۂ خون ہوکر تیسری دفعہ ہم چو بلائے ناگہاں آفتِ آسمانی چڑھ آئی اور مکانات بیرون واندرون میں مانند مور دِ تلخ کے پریشان ہوکر دروازہ ہائے ہر ایک مکان کو معہ قفل ہائے صنادیق وبضر باتِ شدید توڑ ڈالا جو مال ومتاع تھا ان میں سے نکالا۔ باڈش جو اور اسباب معہ نقدی پسند آیا دست بدست باندھ کر ہم چو بارِ اعمال اپنے کے برسر اٹھایا اور اس عرصہ میں بہ تلاشِ صاحب پالکی خانہ بھی جابجا درودیوار سے بہت سر مارا مگر بے حکمِ حاکمِ حقیقی کچھ نہ ہوا چارہ۔ اس وقت جو نوبت کہ صاحب پر گزری تھی تحریر اس کی سے قلم مانندِ شاخِ بید کے تھراتا ہے۔ کاغذ کا جگر شق اور منھ سفید پڑا جاتا ہے۔ یعنی صاحب معہ میم صاحبہ و ایک مسیح بابا اپنے کے بالا خانہ پر زیرِ ہمہ سوختنی چھپ کر فرشِ زمین ہو رہے تھے۔ صدمہ خار وحبسِ دم میں سے جانِ ناتواں کو کھو رہے تھے۔ مطلع

شمع شاں جلتے ہیں چپ بیٹھے ہیں آس مارے
گر ہلاتے ہیں زباں جاتے ہیں گردن مارے

ہر کھٹکے پر یہ خیال تھا کہ اب نیچے سے کچھ خبر ہماری یہ گروہ پاکر بالائے بام آتا ہے اور ہم کو جامِ اجل پلاتا ہے اور غارت گری کے ہاتھ سے گھر کی صفائی تھی۔ اُدھر جان لبوں پر آئی تھی۔ وہاں ان کو زر و مال سے کام تھا یہاں ان کو دم شماری تھی لب پر خدا کا نام تھا۔

اسی دم بجز حافظِ حقیقی کوئی یار تھا نہ مددگار تھا۔ صرف دم اپنا تھا سو وہ ہی اپنا عدو خوں خوار تھا۔ اشعار

ایک عالم کو آزما دیکھا
جس کو دیکھا سو بے وفا دیکھا
حالِ بد کا شریک دنیا میں
نہ برادر نہ آشنا دیکھا
مٹ گیا ایک دم میں مثلِ حباب
یہاں ذرا جس نے سر اٹھا دیکھا

سچ ہے دنیا مریضِ خانہ ہے
رنج میں سب کو مبتلا دیکھا

انجام کار جب تک وہ نابکار اپنے تخت وتاراج کی کار میں مصروف رہے حکمِ الٰہی نے قدم ان کا طرفِ بالا خانہ کے جہاں صاحب مخفی تھے نہ اٹھایا بلکہ بعد غارت گری کے پیچھے ہٹایا۔ شعر ؎

اسے فضل کرتے نہیں لگتا بار
نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

جب کہ مطلع غبار اس ہنگامۂ جرار کا صاف ہوگیا۔ ایک عرصے کے بعد صاحب بہ ہمراہانِ خود بالا خانہ سے نیچے تشریف لائے بڑی دیر میں بہ ہوش وحواسِ اصلی در آئے۔ پسِ ازاں اسی روز شام تک جو کچھ اسباب جزوی باقی ماندہ پڑا تھا اس کو فراہم کر کے ایک تہہ خانہ کے گوشہ میں لگایا اور گھر کے رہنے سے دل اٹھایا۔ نظم ؎

حسرت اے صبحِ چمن ہم سے چمن چھوٹے ہے
مژدہ اے شامِ غریبی کہ وطن چھوٹے ہے
نوح کشتی سے خبردار کہ یاں سینے سے
زخمِ تازۂ ناسورِ کہن چھوٹے ہے

چنانچہ اول میم صاحبہ ومسیح بابا کو اسی شب بہ مکانِ شیخ خوش وقت علی صاحب دوست وہمسایۂ خود بھیج دیا اور آپ ساعت وہیں دم لیا۔ دو روز تک ان کو لواحقانِ شیخ صاحب نے حقِ ہمسائیگی جیسا کہ چاہئے ادا کر کے اپنے گھر میں اتارا اور خاطر داری کو بدستور کیا گوارہ۔ زاں بعد حسبِ صلاح صاحب کے پھر تیسرے روز میم صاحبہ ومسیح بابا وہاں سے بہ خانۂ خود آ کر بہ تغیر وتبدیلِ لباس دل میں حراس بہ حویلی مس میڈلین پدرون صاحبہ [17] رشتہ دار اپنی کے کہ خالی پڑی تھی مصلحتاً وخفیاً تشریف لے گئیں۔ اپنے غریب خانہ غم کا شانہ کو جواب دے گئیں۔ دریں ضمن صاحب نے بھی چندے اس حویلی میں رہنا اپنا مناسب جانا اور کہیں نہ پایا ٹھکانا وہاں بہ ہزار حسرت وحرمان صدہا تفکر وخلجان تا ایک ماہ بسر اوقات کی اگر دن کو

ساتھ صبر و شکر کے طے کیا تو رات کالی بلا ہو کر سر پر آئی اور جو رات بصد تردداتِ پوری کر پائے تو صبح اس کی چرخ نے صبحِ محشر سے کم نہ دکھائی شب و روز لختِ جگر کھانی اور خونِ دل پینے کے کام تھا باقی اللہ کا نام تھا۔ ناسخ ؎

خوش ہوا بھولے سے گر دل غم وہیں یاد آ گیا
قہقہہ ہونٹوں تلک پہونچا کہ نالہ بن گیا

تمام رات آہٹ پہ کان کھٹکے پر نظر رہا کرتی اور رات کو جو کوئی پکارتا تو روح قالب سے اڑا کرتی۔ کوئی ملازم آ کر سناتا کہ آج چار طرف سے کالوں کی آمد بہ زور و شور ہے کوئی یہ خبر لاتا کہ کل سے شہر میں حاجیوں کا طور بے طور ہے۔ حتیٰ کہ شدہ شدہ ملازمانِ حاضرین کی بھی نظر بدلی پائی تب ان سے بھی اپنی آنکھ چرائی۔ کاروبار روزمرّہ اپنے ہاتھ سے گوارہ کیا وقت سے بے وقت ان سے بھی کنارہ کیا۔ غرض کہ صبح و شام بے دلِ ناکام یہ غزل جرأت کی وردِ زبان رہتا اور دلِ مضطر کیا کیا صدمہ سہتا ؎

جرأت یہ شکل یہی گردش ہے ہم کو سارے دن
کہ جو تم پھراؤ تو صاحب پھریں ہمارے دن
نہیں ہے تیرے مریضانِ عشق کا چارہ
اب اپنی زیست کے بھرتے ہیں یہ بچارے دن
یہ وصل کیوں کہ مبدل ہوں ہجر کے ایام
مگر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دن
کب اس سے ہوگی ملاقات یہ پوچھوں ہوں
ذرا تو دیکھ بخوبی میرے ستارے دن
لگایا روگ جوانی میں کیوں میاں جرأت
ابھی تو کھیل تماشہ کے تھے تمہارے دن

خلاصۂ کار اسی طرح بہ رنج و افکار تمام مہینے بسر ہوئے اور 7 جولائی 1857ء کو فلکِ کج رفتار نے ایک حادثۂ جاں کاہ سنایا یعنی خط وفات نورِ چشمی میاں کارندہ صاحب کا مقام فتح پور[18] سے آیا

کہ اس سے اپنا رنج والم کافور ہوا شیشۂ دل اس سنگِ عظیم سے چور ہوا ناچار صبر کو رفیق اپنا بنایا اور کچھ بن نہ آیا۔ دوسرے روز جب 8 رجولائی 1857ء آئی گویا صبح محشر و شبِ دیجور ہمراہ لائی پھروہی قیامت کی خبر اس نے سنائی یعنی بعض بعض ملازمان نمک بہ حرام واقف کاران بد انجام نے گندم نمائی و جو فروشی کر کے خفیہ کالوں کا بھلا منایا اور صاحب کا برا ٹھہرا کر یہ رازِ نہ ہفتہ ان تک پہنچایا۔ وہ مطلع ہوتے ہی خون برسانے کو تیار تھے گویا دلِ بادل کی طرح بے شمار تھے۔ چار طرف سے بجلی کی مثال چمک کر دونوں مکانوں پر حملہ آور ہوئے اپنے جامۂ جہالت سے باہر ہوئے۔ ان میں ایک گروہ کالوں کا تھا اور دوسرا قافلہ شہر کے حاجیانِ بد اعمالوں کا تھا اور ان کی رہبری کو بعض بعض واقف کار پُر از کینہ سیاہ سینہ ہمراہ آئے۔ شرط صاحبِ سلامت کی صاحب کے ساتھ بجالائے ان مکانِ مذکور صاحب پر لے جا کر اور پتہ نشان اس تہہ خانہ کا جہاں اسبابِ باقی ماندہ مقفل کر دیا تھا بتا کر دست برد کر دیا۔ بادش حویلی پتروں گنج میں لا کر جو کچھ ہاتھ پڑا معۂ تمامی اسباب مس میڈلین پیڈرون صاحبہ کے خوب لٹوایا۔ یہاں تک کہ دونوں حویلیاں اس دفعہ مانند سینہ صافی دلاں ایسی صاف و پاک ہوگئیں کہ سرمۂ چشم کے لئے بھی غبار ڈھونڈھا نہ پایا اور مال و اسباب کی طرف سے ایک تنکا خلال تک کو نظر نہ آیا۔

بجز فرشِ زمین اور سب خاک میں ملایا۔ قریب 25 ہزار کے نقد و اشیا صاحب کا برباد ہوا نظرِ باغیانِ بدنہاد ہوا مگر بحکم الٰہی یہ چیز گزری کہ قبل اس ہنگامۂ پردازی کے صاحب نے مصلحتِ وقت دیکھ کر میم صاحب کو معۂ مسیح بابا بہ تبدیلِ صورت و سیرت براہ دروازۂ باغ بہ خانۂ خاکروب ملازم قدیم روانہ کر دیا اور آپ بہ دمِ واحد ایک مکان کوٹھیار میں مخفی ہو کر آشیانہ کر دیا۔ اس کوٹھیار کے اندرون ایک انبارِ ازیں ہزار ہا من ہمیہ سوختنی کا بہت مدت سے پڑا ہوا تھا اس کے تہہ زمین کے ایک گوشے میں بیٹھ کر پناہ لی، جان بچانے کی راہ لی مگر اس تحت السرا کی کیفیت لکھوں تو آنکھوں تلے اندھیرا آتا ہے شبِ دیجور کو شرماتا ہے۔ ایک طرف گرمی کی شدت سے آدمی کا کلیجہ منہ کو آتا تھا دوسری طرف حبسِ دم میں سے دم نکلا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے مچھران و موشان کا وہ زور سوار تھا کہ چار طرف سے مانند کالوں کے

خون کے نوالوں پر ہاتھ مارتے تھے۔ وہ بھی صاحب پر دانت رکھ کر دانت اپنے سنوارتے تھے۔

مزید برآں سانپ و بچھو وغیرہ کا تو وہ مخزن تھا۔ ان کی طرف سے ہر دم یہی خیال تھا کہ یہ موذی اگر نکل آئے تو کب چھوڑیں گے کالوں سے پہلے مار کر منہ موڑیں گے۔ اس وقت من کے من میں رہ جائے گی بے آئے جان جائے گی غرض اس وقت ہر حال میں صاحب مصروف بہ یادِ الٰہی تھے۔ بہ حالتِ تباہی تھے۔ حقیقت اس مصیبت و جاں کاہی کی جس پر گزری ہو وہ ہی جانے ہر ایک کیا پہچانے کبھی یہ غزل رجب علی سرور کی حسبِ حال اپنے پڑھ کر شکر اس کا ادا فرماتے تھے۔

لکھا ہوا یہی قسمت کا تھا سو جان ملا
کہ خاک میں مری محنت دی آسمان ملا
ہزار صدموں پہ دل نے ہماری اف نہ کی
جو ایک رفیق ملا وہ بھی بے زبان ملا
نہ ہم نے چین بہ زیرِ فلک کبھی پایا
عنایتِ ازلی سے عجب مکان ملا
تری تلاش میں در در بھٹکتے پھرتے ہیں
ملا نہ تو ہی تو خوبی سے وہ جہان ملا
بہت جہاں کی کری سیر اے سرورِ حزیں
بہے بے خزاں نہ کوئی ہم کو بوستان ملا

اور کبھی یہ اشعار استاد کے دل میں پڑھتے جاتے تھے۔ نظم

اس درد دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو
اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں
اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو

اس عرصہ میں تنِ چند از سپاہ باغی روسیاہ بعد فراغِ کار اس کوٹھار کی طرف آئے دیکھا کہ انبار لکڑی کا تابہ ثقف اوس کے بھرا ہوا ہے۔ بھوسہ وغیرہ کاٹھ کباڑ پڑا ہوا ہے۔ ایک نے کہا اس کے اندر صاحبِ مال خانہ کو ضرور چھپا پائیں گے اگر اس بار انبار کو اٹھائیں گے۔ دوسرا بولا ایسی جگہ صاحب لوگ کب روپوش ہو سکتے ہیں۔ یہ جگہ خار دار و پُر از غبار ہے۔ اس کا خالی کرنا ہمیں دشوار ہے۔ تیسرا کہنے لگا کہ اگر رقعہ اشتبا وقصہ کو تاہ کرنا ہے تو اس مکان کے اندر آگ لگا دو خاکستر کر کے جھگڑا چوکے دوپہر جوان کے دل میں کچھ آیا دس بیس بار انبار کو وہاں سے اٹھایا مگر جب حکمِ الٰہی نہ پایا ہار جھک مار کے سب نے منہ موڑا۔ اس خیالِ خام کا پیچھا چھوڑا۔ بعدہٗ انہوں نے ایک خاکروب کو بطورِ بجز جا بجا بہ خانہ خاکروبان محلّہ مامور کر کے سمجھایا کہ صاحب لوگ باخانۂ خاکروبان ضرور ہوں گے۔ ان کی خبر لاؤ اور ہم کو وہاں لے جاؤ۔ چنانچہ وہ مخبر میم صاحبہ تک ہی پہونچا۔ یہ سن کر میم صاحبہ نے اس کو پانچ روپیہ دے کر رخصت دی جان بچانے کی صورت کی۔ اس کے جاتے ہی بلا کی آمد ہوئی اور فوجِ باغی میں سے چند آدمیوں کی حویلی سے بطرف خاکروبان برآمد ہوئے یعنی کسی جاسوس نے خبر میم صاحبہ کی ان کے کان میں ڈال دی کہ سنتے ہی چراغ پا ہو کر وہ تیرہ بخت بگلہٗ احزان ان خاکروبان کے جہاں میم صاحبہ موجود تھیں دوڑے آئے۔ تشنۂ خون ہو کر اجل کو ہمراہ لائے اول جاتے ہی مستوراتِ خاکروبانوں کو دھمکایا۔ بطلبِ میم صاحبہ شور وغل مچایا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر فرنگی کہاں سے آئے۔ ہاں البتہ دو چار عورتیں مسلمانوں کی کہیں سے بھاگ کر آ بیٹھی ہیں تب وہ مفسد کہ قریب دس آدمی کے تھے کہنے لگے کہ وہ کہاں ہیں ہمارے آگے لاؤ ان کو جلد بلاؤ۔ اسی وقت میم صاحبہ نے بہ حکمِ ایزدی روپوش ہونا مصلحت نہ جان کر چار و ناچار معۂ مسیح بابا و دوسری کنیزگانِ ہمراہی روبرو آ کر ان سے بہ جرأت تمام کلام کیا۔ ایسے وقت پر کام کیا۔ اول اپنے کو معہ مسیح بابا بہ حفظِ جان مسلمان بنایا۔ آپ پردہ کیا۔ کنیزکوں کو در پردہ آگے بڑھایا وہ لوگ کنیزکوں سے دریافت کرنے لگے کہ تم سب کہاں سے آئے ہو اور کون ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم بے چارے مسلمان ہیں تباہ و پریشان ہیں اور یہ دو عورتیں پردہ دار ابھی ہمارے مرد شادی کر کے لائے ہیں اس واسطے یہ البتہ پردہ

کرتی ہیں اورتم سے ڈرتی ہیں۔ ایک بولا کہ ان کا جسم سرخ وسفید معلوم ہوتا ہے تمہارا بیان ہم کو دھوکہ دیتا ہے۔ یہ دونوں فرنگن ضرور ہیں۔ سچ بتاؤ ورنہ سب کو ایک دم میں تہہ تیغ کیا جائے گا۔ تمہارا علاج یہی ہم کو پسند آئے گا۔ میم صاحبہ نے بہ حکمتِ عملی جواب دیا کہ ہم تو فرنگیوں سے کنارہ و پرہیز کرتے ہیں، محمدؐ کا دم بھرتے ہیں تم کو قتل کرنا ہے تو حاضر ہیں ورنہ مسلمان بحرصورت ظاہر ہیں۔ پھر دوسرے نے پوچھا کہ مرد تمہارے کہاں گئے کہ جو تم نے اہلِ اسلام ہوکر بہ خانۂ خاکروب قیام کیا۔ کنیزکوں نے جواب دیا کہ مرد ہمارے اس حویلی والے صاحب کے نوکر تھے جب آج حویلی کی لوٹ ہونے لگی تب ہم خوف زدہ وہاں سے فرار ہوئے زندگی سے بیزار ہوئے مرد ہمارے پیچھے کہیں شور وغل دیکھ کر رک گئے ہم آگے نکل آئے۔ اس واسطے بہ انتظار ان کے بہ خانۂ خاکروب ٹھہر گئے۔ پھر پوچھا کہ تمہارے مردوں کا کیا نام ہے اور حویلی والے صاحب کا اب کہاں قیام ہے۔ کنیزکوں نے کہا ایک کا نام امام خاں، دوسرے کا نام دیدار خاں ہے اور صاحب کی ہم کو خبر نہیں ہے۔ پہلے ہی روز سے خدا جانے کدھر فرار ہوئے اور کہاں گرفتار ہوئے۔ پھر سوال کیا کہ اگر یہ دو عورت پردے والی کرسٹان نہیں ہیں تو تم ہمراہی ان کے قسم کھاؤ اور ہم کو صدق اس کا دلاؤ۔ کنیزکوں نے بصد ہا قسم اپنے دین وایمان برائے حفظِ جان کے ان سنگ دلوں کے آگے کھائیں تب یک گونا ان کی باتیں نرم ہوئیں۔ پھر بولے اگر مسلمان ہو تو ہمارے ساتھ آؤ ہم پہنچا دیں گے تمہارے مردوں کو ملا دیں گے۔ میم صاحبہ وغیرہ نے جواباً کہا کہ بدوں آنے مردوں کے ہم کیونکر چل سکتے ہیں۔ یہاں سے دن کو کب نکل سکتے ہیں۔ کہا کہ نہیں ابھی ہمارے سامنے اس خاکروب کے گھر سے حویلی کی طرف چلی جاؤ یہاں سے ہوا کھاؤ ورنہ بہتر نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر بہ ہزار قیل وقال وہاں سے پھر قدم اٹھایا اس کو غنیمت جان کر ان کفاروں خونخواروں سے پیچھا چھڑایا بعد اس کے جب وہ بلائے تخت دفع ہوئی مہتاب سے [illegible] آفتاب گوشۂ مغرب میں تشریف لائے تب میم صاحبہ معہ ہمراہیان اپنے وہاں سے بہ حالت پریشان افتان وخیزاں روانہ ہوکر تھوڑی دور پر بہ خانۂ کافر ملازم خود ساختی ٹھہریں۔ کافر نے اس حال میں دیکھ کر صاف جواب دیا کہ میں دھوبی کا کتا ہوں کہ [illegible] کا نہ گھاٹ کا۔

دوکان کا نہ ہاٹ کا اور میرے گھر پر آپ کے لائق جگہ کہاں جو ٹھہراؤں اور اگر ایسا کروں تو اپنی جان کہاں پاؤں۔ وہاں سے بھی یہ سن کر پھر حویلی واقع پدرون گنج میں قدم رکھا اتنے میں صاحب بھی بس از دفعیہ اس آفتِ آسمانی قہربانی کے تکلیفِ جسمانی و روحانی سے نجات پاکر باہر آئے۔ سب یکجا بیٹھ کر شکر معبود دم بدم بجالائے اس رات کو جس طرح ہوسکا بہ فرشِ زمیں بسر کیا صبح وہاں کے قیام سے بھی درگزر کیا۔ مطلع ؎

پاؤں میں تو اگلے ہی اب تک مرے چھالے ہیں
اور یہاں میری وحشت نے پھر پاؤں نکالے ہیں

آخرش یہی صلح ٹھہری کہ اب یہاں سے بھی بارِ اعمال بر دوش اٹھایئے جہاں خدا لے جائے وہاں جان بچایئے ورنہ اب کی دفعہ بالا ضرور اپنا کام ہوجائے گا قصہ تمام ہوجائے گا بقول میاں نصیر کے ؎

تیری الفت میں ہوئے جان کے خواہاں کتنے
تشنۂ خوں ہیں مرے گرد مسلماں کتنے
نہیں لگتا ترے ناقہ کا پتہ او لیلیٰ
جہاں مارے ترے مجنوں نے بیاباں کتنے
جو گیا ملکِ عدم کو نہ پھرا ہائے نصیرؔ
اے اجل تونے کئے خانۂ ویراں کتنے

چنانچہ صاحب نے وہاں سے بہ تبدیلِ لباس روانہ ہوکر بہ خانۂ مسمّی بھجو چمار ملازم اپنے کہ قریب تھا قبل از طلوعِ آفتاب پہونچ کر پھر خدائے کریم سے لو لگائی اور میم صاحبہ معہ مسیح بابا بیچ گھر عبداللہ خانہ زاد کے جاکر وہاں چندے قیام کے ٹھہرائے جلوۂ کارسازِ بے نیاز کہ جو ایسے ظلمت کدہ میں برقِ سخت نظر آیا تیرہ بختوں کے ستاروں کو چمکایا یعنی پہنچنا اس وقت شیخ خوش وقت علی صاحب کا مانندِ وحی آسمانی اور پیش آنا بہ اخلاقِ زبانی بعدہ لے جانا باعزت و آبرو صاحب کو معہ عیال و اطفال اپنے مکان پر اور رکھنا بصد خاطر و اطمینان تا امن و امان۔ محررانِ عجائب نگار و کاتبانِ عجوبۂ روزگار یوں رقم فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ زہے

شان اس خالقِ زمین و زمان کے ہے کہ جس نے ایک قدرتِ کاملہ اپنی سے ایسا گلزارِ گیتی لگایا جس میں ہر ایک گل کا الگ الگ رنگ و بو بنایا بقول ابوظفر صاحب ؎

گل کے چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر یہ کیا بہار
سب کا ہے رنگ جدا جدا سب کی ہے بو الگ الگ

جائے غور ہے کہ انسان ضعیف البیان اس کے یک رنگیٔ قدرت کا ایک گل ہے اور دنیا اس باغبانِ حقیقی کا ایک باغ بالکل ہے جس کے ہر پتے و بوٹے کا رنگ چشمِ حقیقت سے رنگ برنگ نظر آتا ہے۔ ہر ایک اپنی بو باس جدا دکھاتا ہے۔ ہر چند کہ ہنگامۂ غدر میں اس گل چیں مطلق نے ایسی بادِ صرصر خزاں چلائی کہ باغِ عالم کی سب نشو و نما میں تخلل لائی مگر پھر جو بغور دیکھا تو بعض بعض شجر برومند کا پتہ بھی نہ کھڑکا ہے حکم اس کے اپنی جاں سے نہ سرکا۔ اسی طور اس معمہ کو سمجھنا چاہئے کہ جو لوگ خدا رسیدہ اور اس کی عنایت کے برگزیدہ تھے اس ولولۂ شیطانی نے لو دیکھ کر اپنی سرنگونی و رضائے بے رحم پر قائم رہے۔ اس کا خوف کر کے ادائے شکر میں دائم رہے اور جو مثلِ کاہ سبک رو تھے انہوں نے کسی کو ہو دیرینہ آدمی کی بات پر توجہ نہ کر کے جدھر کی ہوا پائی اُدھر اڑ کر بہت خاک اڑائی۔ اسی واسطے کسی نے کہا ہے کہ پانچوں انگشت یکساں نہیں ہیں۔ اس قادر کی قدرت کے کچھ حساب و بیان نہیں ہیں اسی ششش و پنج میں صاحب تھے کہ ناگاہ شیخ خوش وقت علی محب دلی حال کثیر الاختلال صاحب کا پیکِ صبا سے سن کر مانندِ نسیمِ سحری کے پاس صاحب کے تشریف لائے ان کو دیکھ کر صاحب کے غنچۂ دل کچھ شگفتگی پر آئے۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ میں بسروچشم حاضر ہوں۔ آپ کے حالِ پر ملال سے بخوبی ماہر ہوں۔ اگر میرا اعتبار ہے تو بندہ برسمِ بندگی تا زندگی تیار ہے آپ کو جس طرح ہو سکے غریب خانہ پر چلنا چاہئے اب زیادہ تر تکلیف گوارہ نہ فرمایئے۔

صاحب نے جواب دیا کہ میرے حالِ شکستہ بال پر آپ نے بہر حال مہربانی ہے آپ کا آنا میری زندگانی ہے لیکن کیا کیجئے کہ اگر چندے یہیں لیل و نہار ہے تو تدبیر خلاف تقدیر سراسر بے کار ہے۔ غزل رجب علی سرور ؎

گر اس کے ہجر میں یونہی اندوہ گیں رہے
تو ہوئے گا وصال الا یہ یقیں رہے
ہے احتیاط شرط کہ اس چشمِ تر پہ گاہ
دامن رہے رہے نہ رہے آستیں رہے
مدفن کا اپنے ہم کو تردد ہو کس لئے
کوچہ کے تیری یار سلامت زمیں رہے
تو گلشنِ وصال کی کر سیر عندلیب
ہم خرمنِ فراق کے بس خوشہ چیں رہے
جو جو کہ انتخاب تھے صفحہ پے دہر کے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نشان بھی نہیں رہے
کس کی خوشی کہاں کی ہنسی کیسا اختلاط
ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے
چھوٹا نہ نزاع میں بھی خیال اس کا اے سرور
دم بھرتے ہیں ہم اس کا دمِ واپسیں رہے

شیخ صاحب نے پھر فرمایا کہ یہ انقلابِ روزگار ہے اس میں نہ کسی کا اختیار ہے۔ ہمیشہ ہر دور میں ایسا دورۂ فلک دوار دکھاتا رہا ہے۔ جو منظورِ خدا ہے وہ بالاضرور بر روح آتا رہا ہے اس دنیائے دوں میں جو شئے با کمال ہے ایک روز اس کو زوال ہے۔ یہ شور و فساد کوئی دن کی کہانی ہے پھر وہی عملِ انگلستانی ہے۔ معاملات قضاً وقدر سے ہر فردِ بشر مجبور و ناچار ہے یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ آپ بحرِ کیف ہے سو جمعیٔ تمام رکھ کر عزمِ غریب خانہ فرمائے چندے وہاں بسر کرنا چاہئے خدا آپ کا حامی ہوگا جلد دفع دردِ ناکامی ہوگا۔ شعر

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل میرا پھر جائے
پھروں میں تجھ سے تو مجھ سے میرا خدا پھر جائے

یہ تقریرِ دل پذیرِ شیخ صاحب کی صاحب کو بہت بھائی۔ شکل امید نظر آئی۔ فرمایا کہ بہتر ہے

میاں کوئی صورتِ خیر نظر نہیں آتی ہے۔ زمین پاؤں سے نکلی جاتی ہے۔ چندے آپ کی
طرف بسر کریں گے اور آپ کی مہربانی کا دم بھریں گے۔ چنانچہ شیخ صاحب موصوف [19]
صاحب کو معہ عیال و اطفال بہ سواری رتھ وغیرہ بہ امدادِ چند کسان بہ اطمینان موضع سنہول
وطن اپنے آپ کو کہ علی گڑھ سے دس کوس طرف شمال کے واقع تھا لے گئے۔ بعد ایک ہفتہ
جوزف پیش صاحب برادر عزیز صاحب کے بھی بہ حالتِ تباہی بصد جاں کاہی توشۂ راہ بجز
حسرت و یاس نہیں دلِ بے چین دوست ہوش و حواس نہیں۔

یہ خبر سن کر متلاشی پناہ گیری وہاں بہ سواری ڈولی آئے بھائی کو دیکھ کر انہوں نے
کچھ حواسِ پریشاں اپنے جمع کر پائے ان پر بھی از بس کہ تکلیفات و چند آفات اس عرصہ میں
گزریں اگر شرح ان کی لکھی جاوے تو یہ قصہ پھر اختتام نہ پاوے مگر سب شکر کہ انہوں نے
بھی جان کی زکوٰۃ میں مال کو لٹوایا تب نیا جنم پایا۔ وہاں شیخ صاحب موصوف تا عرصہ تین ماہ
دونوں صاحبوں اور چھ مہینے تک میم صاحبہ کو بہ گوشۂ عافیت جگہ دے کر ایسی خاطر و مدارات
سے پیش آئے کہ شکر اس کا حیطۂ بشری سے مبرا ہے جو کچھ ان کی شان میں اشہبِ خامہ
جولانی کرے روا ہے۔ شب و روز نگراں ہر ایک امر کے رہ کر باکمال دل جوئی پیش آتے
رسم مہمان نوازی بہ ایں نہیں ادا فرماتے۔ ہمیشہ مردمان معتمد اپنے شہر کول و بھیج کر خبر تازہ
وہاں کی صاحب کو سناتے ان کے دیہات گرد و نواح میں جو کوئی چرچا صاحب کی طرف کا
کرتا اس کو بہ حکمت عملی پر جا کر ارادۂ بے جا سے بعض رکھتے غرض ہر طرح سے مخفی یہ راز
رکھتے۔ ہر روز لطیفہ و بذلہ سے صاحبوں کے دل افسردہ و شگفتہ فرمایا کرتے۔ غم و کلفت دل
سے بھلایا کرتے۔ ہر چند اس وقت کہ گنوار روکی مفسد و سپاہ سیاہ سے حد درجہ زیادہ تھی روز و
شب گنواروں کی طبیعت جنگ و جدل پر آمادہ تھی۔ ان شیخ صاحب کا جس قدر [illegible]
دیہات کا تعلقہ تھا ان کی خوش نیتی سے اس میں کسی نے پتہ نہ [illegible] کا یا [illegible] نہیں پتہ نہ پایا۔
بلکہ سب علاقہ ان کا حامی رہا بدستور سابق رہا۔ [illegible] صاحب کو ہر وقت یہ خیال رہتا
ہمارے سبب سے کوئی زندان پر نہ آئے۔ [illegible] شیخ صاحب و [illegible] فدمت [illegible] تا [illegible]
[illegible] کاریگر [illegible] بہ امن رہیں تو ہماری بات رہ جاوے۔ اگرچہ بقول شخصے [illegible]

نہیں سکتا۔ یہ خبر اڑتے ہوئے شدہ شدہ تا باغیانِ شہرکول بھی پہونچی کہ اس نواح کے کسی گاؤں میں چند صاحب لوگ پناہ گیر ہیں مخفی نا گزیر ہیں لیکن شیخ صاحب کی خوش طالعی سے کارسازِ حقیقی نے کسی مفسد کا قدم اس طرف کو نہ اٹھایا بلکہ سب کو پست ہمت کر کے بٹھایا ورنہ شہرِ کول میں حکمرانی صوبہ مسلمانی سے یہ حال تھا کہ فرنگیوں کے نام سے ہوا پکڑی جاتی تھی وہم وگمان کی خرابی آتی تھی۔ گھر گھر تیغ اور دیغ کا زور تھا۔ محمدی جھنڈی کا غلوشور تھا۔ مفت کا خزانہ ہر روز چلا آتا تھا۔ ایک ایک مسلمان ہزار ہزار من کھلاتا تھا۔ کوئی صوبہ دار تھا کوئی تحصیل دار کوئی حاکمِ عجوبہ تھا کوئی حکم بردار تمام شہر کو دستِ ظلم سے سرِ دست ہلاک کر ڈالا۔ اپنا کیا بول بالا آخر کار ظالم کی عمر کوتاہ ہے۔ پھر چند روز میں بروقت آنے افواجِ گورا کے آگرہ سے ایسا نیچا دیکھا کہ آنکھ اونچی نہ کر پائے۔ بجز فراری اور تدبیر نہ بن آئی۔ صوبہ وغیرہ سب فی النار ہو گئے۔ روپوشی وخاک بسر کرنے کو تیار ہو گئے۔ کسی نے چولھے میں چھپ کر جان بچانے کی راہ نکالی کسی نے چکّی تلے گردن ڈالی۔ الا حاصل اس وقتِ نازک میں کہ خدا پھر نہ دکھاوے ایک دن پہلے ہی دنیا سے اٹھا دے شیخ صاحب کا بہ ایں الطافِ دلی ہم لوگوں اہلِ فرنگ کے ساتھ پیش آنا اور صفائی قلب سے محبّ نوازی فرمانا اور نشیب وفراز اس زمانے کے شب وروز دیکھتے جانا کچھ تھوڑی سی بات نہیں ہے بلکہ لائق وجہ وحکایات ہے۔ اس ہمہ صفت موصوف کی بہت بڑے صفات ہے اگر اس وقت کا بہ حقِ اہلِ فرنگ مسیحائے زماں لکھوں تو بجا ہے۔

حامیِ انگلشیان کہوں تو روا ہے۔ چشمِ مروت جس کا نام ہے وہ ان کے دراخلاق پر سلامی صبح وشام ہے۔ حق بینی جس کو کہتے ہیں اس کو فیضانِ صحبت ان کے سے ہر دم کام ہے۔ ہر کلمہ وکلام سے بوئے اخلاق چلی آتی ہے ومجموعہ خود ہائے میں خامۂ بریدہ زباں سے کب خود ان کے لکھے جاتی ہے۔ وضع داری ہر ایک طرح کی ان پر ختم ہے۔ طبیعت ان کی دوسر دشمن سب سے پیہم ہے۔ دوستوں سے دم بہ دم لطف وحکایات ہے۔ معاندان سے ہمیشہ صلح ومدارات قہر وغضب جو سنا جاتا ہے وہ بہ غضبِ الٰہی ان کے در سے کوسوں دور ہے۔ اس طرح کے حلیم وسلیم ہیں اس واسطے عالم کی خیر وصلاح نیک ومنظور ہے۔ مزید

براں عنایاتِ الٰہی سے دنیادار وصاحبِ اولاد ہیں۔چمنِ کائنات میں سرسبز وآباد ہیں۔چند پسرانِ نوجوان وخوش گزران بہت خلیق وطرح دار ہیں۔سب سے رکھتے نیاز و پیار ہیں۔ چنانچہ مؤلف کے ضمیمۂ دوست دار ہیں۔ان کی ثنا میں یہ دو اشعار ہیں ؎

حمیدہ صفات و خجستہ خصال
سراپا ہیں وہ لوگ فرخندہ فعال
جوانی کے گل اور مرادوں کے باغ
ہے خوشیوں سے ان کی معطر دماغ
خدا خوش رکھے ان کو ہر دم مدام
یہی ہے دعا میری اب صبح و شام
مسرت و فرحت و ولایت ہے نام
اسمِ بامسمیٰ ہیں وہ لا کلام
وہ مدت سے ہیں پیش کے دوست دار
ہے درپیش اس کو یہی یادگار

القصہ شیخ صاحب بایں ہمہ باغ و بہار باخدا و پرہیزگار ہیں۔سب سے رکھتے صفا لیل ونہار ہیں۔معاش کی طرف سے اچھی بود و باش وگھر کی تعلقہ داری قدیم الایام سے جاری ہے۔ چند دیہات کی زمینداری ہے۔اس میں بہر صورت گزر اوقات وفصل باری ہے۔حتیٰ کہ ان کے اوصافِ حمیدہ میں زبانِ خامہ ہر دم لال ہے۔وہ شخص ایسا ہے اپنی قوم میں بے مثال ہے۔قصیدہ مؤلف در مداح شیخ صاحب موصوف ؎

تجلی جہاں میں جب تلک خورشید خاور ہو
بنا تاریکیٔ ظلمات تا گردوں پہ اظہر ہو
کمان کہکشان شب نمایاں تا فلک پر ہو
خیال مرغ کا جب تک کہ قائم بال اور پر ہو
معاون میرے ہوں خوشوقت علی اور بخت یاور ہو

قلم وہ ان کا ایک عالم مثالِ مہرِ انور ہو
رہے جب تک نسیمِ صبح کو ہر صبح سے فرحت
کرے جب تک شہِ گل تختۂ گلزار پر زینت
رکھیں بلبل پہ نازک طبع جب تک عشق کی نیت
رہے پروانوں کی جب تک کہ لو پہ بزم میں کثرت
عدو کا خون یا مالی ترے تیغِ کا جوہر ہو
ہر اک قصبہ میں زر ہو اور زر پر کانِ گوہر ہو
رہے قائم بنائے دینوی جب تک کہ پانی پر
صدف دریا میں پیدا ہو بنے قطرے سے تا گوہر
برائے لال جب تک چاک ہووے سینۂ پتھر
رہت پنہاں شرارِ سنگ جب تک سنگ سے اظہر
شمیم زلفِ شاہد ہے دماغِ دل معطر ہو
دعائے بے قصاں ہو پشت پر انجم کا لشکر ہو
دلائے یادِ سنبل پیچ تا زنجیرِ کاکل کا
بہارِ گلشنِ ہستی میں تازہ تا ہو روح گل کا
رہے تا بزم مجنونان میں دورہ ساغر و ملکہ
نشیمن تا کہ شاخِ گل ہو اور گل دل ہو بلبل کا

جہاں کہ دارِ گردانی میں جب تک چرخِ اخضر ہو
ہمیشہ تیرا اے دستِ کرم طالع سکندر ہو
رہے جب تک کہ قائم داغِ گل لالے کے سینے میں
عروسِ دیں کو شیخ و برہمن جب تلک دل دیں

خیالِ آہوں آتا بتا کہ میدان میں دم لیں
جہاں میں جب تلک اے پیش اسپ پابند ہمت ہیں
بہارِ عیش سے تیرے گل مقصود میں بر ہو
شجر باغِ تمنا کا ہمیشہ تازہ و تر ہو

اگر تمام عمر بہ جلاوی شکر و سپاس اس تلطف و احسان بے قیاس شیخ صاحب کے بریں موی ہزار زبان ہو کر ہم لوگ لب بہ ثنا کھولیں تب بھی عشرِ عشیر اس کا ادا نہ کر پاویں بلکہ منھ دیکھتے رہ جاویں۔ اب تک جس صاحبانِ عالیشان کے روبرو یہ تذکرہ آتا ہے وہ متعجب ہو کر بہ مداح شیخ صاحب رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ درحقیقت جان کا بچانا بڑا کارنمایاں ہے۔ دنیا و دین میں اجر اس کا بے پناہ ہے۔ اگر مؤلف اس ضلع کا حکمراں ہوتا تو بلا شک رپورٹ عطائے جاگیر کی نسلاً بعد نسلاً ایسے شخص کی نسبت بہ حضورِ نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کرتا۔ دم التفاتِ کریمانہ اس مجسم کرم کا ہر دم بھرتا مگر اب بھی مقام ہزاراں ہزار شکر و حمد اس خدائے اجز و جل کا ہے کہ شیخ صاحب موصوف نے اندر باب نے ایسا خطاب خیر خواہی سرکارِ دولت مدار سے پایا کہ جس کو تا قیامت بے زوالی ہے۔ یہ بھی ان کی خوش اقبالی ہے اور قناعت کا حال اگر ان کا حوالۂ قلم کیا جائے تو یہ دریا اس کوزۂ تحریر میں کب سمائے یعنی باوجود اس دولت خواہی سرکار کے کبھی اپنی طرف سے درخواست کی امداد کے پیش گاہ حکام وقت کے زبان پر نہ آئی بلکہ اس میں ننگ و عار پائی۔ شاید کہ شیخ سعدی نے یہ مقولہ ایسے ہی شخصوں کے واسطے فرمایا ہے جس کا ذکر کریمان میں آیا ہے۔ شعر

قناعت بہر حال اولیٰ تر است
قناعت کند ہر کہ نیک اختر است

حاصل کلام جب بعد چند ماہ چند افواج کو راجبت سروہی باغیان ملک [illegible] آئے اور بادشاہ خبر تشریف آوری صاحب ضلع کی شیخ صاحب نے پائی تب ایک چٹھی انگریزی از طرف ہر دو صاحبان مہمان اپنے کے بخدمت صاحب ضلع لکھوا کر روانہ کی۔ وہاں سے صاحب ضلع نے دو صاحبان کو طلب فرمایا۔ [illegible] آیا چنانچہ شیخ صاحب نے بذات خود

دونوں صاحبوں کے ہمراہ ہو کر ان کو با اعلیٰ خدمت مسٹر کوکس صاحب بہادر [20] حاکمِ وقت بخیر عافیت تمام پہونچایا جو کہ کلمہ خیر خواہی بن آیا۔ پیش گاہِ صاحب معزاللہ ادا فرمایا۔ صاحبِ ممدوح اس راست بازی سے شیخ صاحب کے نہایت مسرور ہوئے۔ متوقعِ کرم و موردِ فرزاحم فرمایا۔ نہایت مشکور ہوئے۔ بعدہ صاحب محتشم اللہ نے تشفی ہر دو صاحبان فرما کر اجازت قیام مکانِ مذکور کے دی۔ ان سے رخصت ہو کر گھر پر آئے دو ہفتہ صرف گزار پائے کہ پھر شہر میں تسلیم اللہ [21] وغیرہ باغیان کا زور ہوا۔ طور بہ طور ہوا۔ چہار طرف سے تشنۂ خون فرنگیان نظر آئے اپنی قضا سر پر رکھ لائے۔ یہ نہ سمجھے کہ پیمانۂ عمر ہماری کے لبریز ہو چکے ہیں۔ اعمال ہمارے ہم کو دین و دنیا سے کھو چکے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی رہنا شہر کول کا پھر نامناسب نظر آیا۔ دونوں صاحبوں نے ہاتھرس کی طرف بہ امدادِ ٹھاکر کھڑک سنگھ صاحب [22] خیر خواہِ سرکار فیض آثار شیسا شب کوچ فرمایا۔

شکل امیر تو کب ہم کو نظر آتی ہے
صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے

وہاں پہونچ کر بہ صلاحِ چوبے گھن شیام داس صاحب [23] تحصیلدار ہاتھرس کہ غم خوارِ حال اپنے تھے خیرے قیام کیا۔ بصد تردّات صبح کو شام کیا۔ چوبے صاحب تا قیام وہاں کے ہمراہِ صاحب بہت مہربانی و توجہ روحانی سے پیش آئے۔ رسمِ مسافر نوازی بہ تکلف بجالائے جو کہ صاحبِ ممدوح بھی مجموعۂ صفات وصد حسنات و برحالِ مؤلف مدت سے عنایت فرمائے بے غایات تھے۔ اس وقت میں بھی اس قدر نگرانِ حال صاحب و پرسانِ احوال خاکسار رہے کہ شکر اس کا بیان سے باہر ہے ایک عالم ان کی خوبی ہائے سے ماہر ہے۔ اگر ان کی خوش اخلاقی و شہرۂ آفاقی کا شمع بہ نوکِ خامہ در آئے تو یقین ہے کہ ایسی ایک اور کتاب تیار ہو جائے۔ مگر مختصراً بہ جہت یادگار ذکر اس برگزیدۂ روزگار کا درج وقائع ہزار کرتا ہوں۔ اول تا اختتام ایامِ غدر انہوں نے بہ جلاوی خیر خواہی و جاں کاہی وہ نام و نشان سرکارِ عالی شان سے پایا اور باوجود معذور ہونے بصارتِ چشم سے ایسا کارِ نمایاں شجاعت و جاں فشانی کا ہر ایک طرح کا ان سے بن آیا کہ اب تک یادگارِ زمانہ ہے۔ زبان زدِ خیش و بے گانہ ہے۔

آخر کار اس وقت میں سرکار سے بہ خطاب و القاب راجہ صاحب ممتاز ہوئے۔ ان کی خیر سگالی و خوش اقبالی کی تا بہ نواب گورنر جنرل بہادر افشائے راز و نیاز ہوئے لیکن چونکہ پیمانۂ عمر اس غریقِ رحمت کا جلد لبریز ہو گیا اس واسطے اس ہنگامہ میں بہ جنگِ قصبہ کا سکنج ضلع ایٹہ کے وہاں فوجِ انگریزی کے ہاتھ خوب میدان رہا اور باغیوں کا نہ کچھ نام و نشان رہا۔ چوبے صاحب سرکار کی طرف سے کام آئے۔ حقِ جاں نثاری بجالائے۔ اس کے عیوض میں سرکارِ دولت مدار نے از عطائے جاگیرات و انعامات ان کے لواحقان و برادران کو مالا مال فرمایا اور دو برادرانِ خوردان کے نے عہدۂ ڈپٹی کلکٹری سرکار سے پایا اور خطاب راجگی چوبے صاحب مفقود کے خاندان کی نسبت برائے دوام پیش گاہ جناب نواب گورنر جنرل بہادر صاحب سے منظور ہو آیا۔ چنانچہ مشفقی مجھے چوبے دھن پت داس صاحب و راجہ جے کشن داس صاحب[24] ڈپٹی کلکٹر برادرانِ خورد صاحبِ مرحوم کے بھی لب خوش اخلاقی و برگزیدۂ روزگار ہیں و نیز الطاف فرمائے ضمیم مؤلف و خاکسار اشعارِ مصنف ؎

برگزیدۂ زمانہ ہیں یہ لوگ یادگارِ فسانہ ہیں یہ لوگ
مجموعہ لطف و منبع الطاف فخرِ خیش و یگانہ ہیں یہ لوگ

اس ضمن میں کچھ افواجِ انگلشیہ آگرہ سے علی گڑھ کی طرف آئی اور شہر کول[25] سے باغیان کی اس پر ہوئی چڑھائی۔ اثنائے راہ میں مابین باتھرس و کول گوروں نے وہ دھجیاں کالوں کی اڑائیں کہ ہوا پر مثل پتنگ اڑتی نظر آئیں، ہزاروں نے پشت پر زخم کھائے، سینکڑوں جوتا چھوڑ کر بھاگتے پائے۔ فوجِ ظفر موج سرکاری نے مارے۔ گرا ب کہ پیچھا نہ چھوڑا تا بہ دروازہ ہر ایک دروغ گو کو مار کر منھ موڑا۔ خانہ بہ خانہ جوئے جوں جاری تھی وہ کوچہ بہ کوچہ لب پر نالہ تھا و آہ و زاری تھی۔ اچھے اچھوں کے سر راستے میں پڑے ٹھوکریں کھاتے تھے۔ سڑک بے دھڑک پر اپنا کیا پاتے تھے۔ آخر کو خوب پتلا حال ہوا۔ گمدی جتھ و پامال ہوا۔ مصحفی ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

بعد اس کے لشکرِ قاہرہ نے آگرہ کی جانب مراجعت کی۔ اس کے ہمراہ صاحب نے بھی جانا آگرہ کا مناسب جانا۔ اپنے کو ادھر کیا روانہ۔ وہاں پہونچ کر جو دیکھا تو عجیب حال ہے۔ تمام شہر و چھاؤنی لوگوں سے خالی ہے۔ باغیوں سے مالا مال ہے۔ تب لاچار ہو کر افتاں و خیزاں قلعۂ آگرہ[26] میں پہونچ کر بہ مجمعۂ صاحبان و سالاران قیام کیا۔ تا فتح دہلی وہاں آرام کیا جملہ صاحبانِ برادری و دوست مان ہم عصری سے قلعہ میں ملاقات بعینہ ہے ہاتھ ہوئی۔ فلکِ ناہنجار کے شکایات ہوئی وہ سب ان کے حالِ زار پر نالاں ہوئے۔ ان کی حقیقت پر عبرت دیکھ کر حیران وانگشت بہ دنداں ہوئے۔ وہ اپنی سرگزشت سنانے لگے۔ یہ اپنی مصیبت دکھانے لگے۔ غزل مؤلف ؎

گئی آج کل جو ہوا پلٹ نہ وہ دور ہے نہ وہ جام ہے
نہ وہ بزم ہے نہ وہ ساقی ہے نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ نام ہے
نہ تو کفر سے مجھے ہے غرض، نہیں دینداری کی کچھ طلب
میرا حامی ایک مسیح ہے فقط اس کے نام سے کام ہے
کبھی قتل کرتے وہ برملا کبھی زندہ کرتے ہیں لب ہلا
یہ سب آپ ہی کا ہے شعبدہ میاںِ عشق تم کو سلام ہے
کبھی ذکرِ عیش جو چل پڑا تو ہزار شرم سے یہ کہا
ہمیں اس کی یاد سے کیا غرض ہمیں اپنے کام سے کام ہے
کبھی وہ بھی دن تھے کہ اے صنم میرے جان و دل کو نہ تھا الم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم نہ وہ چین ہے نہ آرام ہے
لگی آنکھ ٹک جو میری دلا اسے خال و زلف میں جا پہناں
دبی پھر جو چشم کھلی ذرا نہ وہ دانہ ہے نہ وہ دام ہے
کہوں سحر اس کو تو ہے بجا کہا شاعروں نے بھی مرحبا
ہوا چرچا اس کا ہے جابجا عجب پیش کا یہ کلام ہے

قصہ کوتاہ جب ماہ ستمبر 1857ء میں خدا نے خبر فتح دلی کی سنائی اور نگہتِ عملداری سرکارِ ابد

پائیدار کی بادِ صباءِ چمن آرزو سے لائی تب جمیں صاحبان قلعۂ آگرہ سے اپنے اپنے دولت خانوں میں رونق افروز ہوئے۔ دلِ افسردہ سب ناشگفتہ روز بروز ہوئے۔ جابجا سے کالے کافور ہونے لگے ان کی جگہ گورے مامور ہونے لگے۔ اس وقت دونوں صاحب بھی آگرہ سے روانہ ہوکر رفتہ رفتہ اپنے گھر علی گڑھ آئے۔ جان بہ سلامت لائے۔ گھر آکر دیکھا تو اسباب وغیرہ کی طرف سے مطلع صاف تھا۔ صرف درودیوار تھے باقی گردوغبار سے شفاف تھا۔ بجز خونِ جگر کچھ توشہ نہ پایا پھر اسی رازق سے دھیان لگایا۔ صاحبِ ضلع کو صاحب نے یہ حالِ سقیم اپنا دکھایا۔ اس ایام میں مسٹر برائنے صاحب بہادر [27] حکمراں وہاں کے ہوئے تھے۔ انہوں نے از راہِ تراحم والطافِ حاکمانہ صاحب کے حالِ پر ملال پر بغایت افسوس اٹھا کے رپورٹ اپنی روانہ صدر فرمائے۔ چند عرصہ بعد پانچ پانچ سو روپیہ دونوں صاحبوں کو بطورِ مد دِخرچ دلوایا اور متوقع دیگر زرِ نقصان کا برائے آئندہ فرمایا۔

اس روپیہ کا عنایت ہونا غنیمت جان کر اس میں جس طرح ہو سکا معہ اعیال و اطفال گزر کیا۔ چند روز بہ ہزار تنگ دستی نظر بخدا رکھ کر زندگی کو بسر کیا۔ بعد ایک دو سال کے بہت سی تحقیقات زرِ نقصان ہر دو صاحبان مظلومان کے ہوکر بیس ہزار کے حرجے میں قریب دو دو ہزار روپیہ کے سرکار نے عطا کیا۔ باقی کے واسطے جواب دیا۔ چنانچہ اس کو بھی مغتنمات سمجھ کر بر سر اٹھا کر گھر آئے۔ شکر خداوندی اس خداوند و شہنشاہ وقت کا بجالائے۔ جو کہ نیت دونوں صاحبوں کی ہمیشہ سے بخیر تھی۔ اب تک اسی میں معہ وابستگان گزارا کیا۔ صبر و خاموشی کو گوارا کیا مگر برائے آئندہ گھر میں صرف اسی کا نام ہے عزت و آبرو کا خدا کے توکل پر اختتام ہے۔ علاوہ اس کے ضعیف و ناتوانی ایسی گلے کا ہار ہے کہ وہ بھی باعث معذوری از روزگار ہے۔ یہ مطلع کسی استاد کا حسب حال زار ہے۔ مطلع

نہ ہاتھوں میں طاقت نہ پاؤں میں جنبش
جو لیں کھینچ دامن ہم اس دلربا کا
سر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے
کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

بہر حال او پر احوال ہر دو صاحبان مقامِ حسرت والم ہے اور ہر دم درگاہِ ایزدی سے امید کرم ہے۔ غالب کہ وہی کارساز ان کا حامی ہوگا۔ اس کے فضل و کرم سے کفِ درد وِ نا کامی ہوگا۔

رہنا کھیت فتح دہلی بہ دست صاحبانِ شہنشاہِ دوراں اور شکست کھا کر فنا ہونا باغیانِ بے ایمان پھر بدستور ہو جانا جلوۂ عملداری سرکار بہ فضل پروردگار۔

پلادے تو ساقی مۂ لالہ فام
ہوا چاہتا ہے یہ قصہ تمام
وہ مۓ دے کہ ہو دور دل سے الم
لکھوں فتح دلی کو میں یک قلم
مصیبت کے ایّام طے ہو چکے
شبِ ہجر میں خوب سا رو چکے
مثل ہے یہ مشہور اے ذی شعور
کہ ہے رنج کے بعد راحت ضرور

محررانِ صحیح البیان اس طرح حوالۂ خامۂ خوش زبان کرتے ہیں کہ عرصۂ ساڑھے چار مہینے تک بہ سرزمینِ دہلی وہ ہنگامۂ قہر آسمانی وغضبِ ربانی کا نمونۂ قیامتِ کبرا جسے کہا چاہئے گرم رہا کہ اس سے تختۂ زمیں تہہ و بالا رہا کیا۔ آسمان چکر میں آیا فرشتوں کے لب پر آہ و نالہ رہا کیا۔ ہر چند کہ کالوں نے حقِ شاگردی در بابِ جاں نثاری خوب ادا کیا اِللہ استادانِ وقت اپنے سے عرصۂ کارزار میں کوئی سبقت نہ لے گئے۔ آخر کار پسپہ ہوئے۔ سر اپنا دست بدست دے گئے۔ ان کا دل بادلِ تمام شہر و گرد و نواح دہلی میں مثلِ مورِ ملخ کے چھا رہا تھا۔ ان کا دم فقط با جماعتِ قلیل صرف پہاڑی پر رنگِ خوں ریزی دکھا رہا تھا۔ جب وہ دروغ گو نمک حرام جوق در جوق کر کے برسرِ مقابلہ آتے تب یہ پہاڑی پر سے مارتے ہوئے تابہ دروازۂ شہر پہنچا جاتے۔ ہر حملے میں شب و روز کالے اس قدر مرتے تھے کہ میدانِ رزم میں ان کا انبار لگ جاتا تھا۔ سطح زمین سیاہ نظر آتا تھا اور گوروں کا ایک دو کشتہ پڑا پاتا تھا۔ ادھر

سے جو گولہ ان کا آتا سنگِ پہاڑی پر سر ٹکرا کر رہ جاتا اور ادھر سے جو گولہ شہر کی طرف چلتا تھا غضبِ الٰہی کی طرح نازل ہو کر اس کی آواز سے رستم کا دل باہر نکلتا تھا۔ یعنی اس کے صدمے سے دھجیاں کالوں کی جوں مورے ملخ اڑتی نظر آتی تھیں۔ روحیں ان کی جہنم کی ہوا کھاتی تھیں۔ گورے جس قدر زخمی ہوئے سب نے سینۂ شجاعت گنجینہ پر زخم کھایا۔ کالے جتنے مرتے گئے سب کی پشت پر داغِ مجروحی نظر آیا۔ جب گولہ زنی کا دونوں طرف سے مینہ برستا تھا دن کی رات ہو کر کالوں کی تیرہ بختی شبِ قیامت کو شرماتی تھی اور جس وقت تلوار و سنگین کے ہاتھ صاف ہوتے تھے خونِ سیاہ کی ندی کالوں کے سر پر پھر جاتی تھی۔ گوروں کی صورت پر روشنی نورِ الٰہی نظر آتی تھی۔ اگر ہزار نعشے کالوں کا ایک طرف اور ایک کشتہ گورے کا دوسری طرف۔ بہ میزانِ شجاعت و انصاف تولا جاوے تو بھی وزن ہزار کا مقابل ایک کے ہرگز پورا نہ آوے۔ قیامت جس کو کہتے ہیں وہ اس کشتہ و خون کی بوچھار دیکھ کر پچھاڑیں کھا گئی۔ رستخیز جس کا نام ہے وہ وقت سے پہلے رنگ اپنا دکھا گئی۔ آسمان و ستارۂ شب و روز گولوں کی آواز سے گونگا بہرہ ہو کر چکرائے فرشتوں کے کلیجے منہ کو آئے۔

اس عرصہ میں جب اور ترقی فوج ظفر موج گورے کی طرف پنجاب سے پہاڑی پر ہوئی تب تو کالے روز بروز کمرِ ہمت شکست کر کے سوتے جمع کافور ہونے لگے۔ مانند بلائے آسیب کے گوروں کے منتر سے مفرور ہونے لگے۔ جہاں لاکھ تھے وہاں آج ہزار نظر آئے اور جہاں ہزار تھے کل سو پڑے پائے۔ کمرِ ہمت ان کی شکستہ ہوئی، رازِ سربستہ کھل گیا، حالت تباہ و خستہ ہوئی، پھر رفتہ رفتہ افواجِ انگلشیہ نے سینہ سپر ہو کر تمام فصیل شہر دہلی متصل کشمیری دروازہ مورچے اپنے لگا دئے۔ طرف ثانی کے دل آبِ شمشیر انگریزی سے بجھا دئے۔ چنانچہ 14 ستمبر 1857ء کو اول کشمیری دروازہ اڑایا بعدہ ٹھنڈی ٹھنڈی براہِ فصیل شستہ شستہ ظفر پیکر نے اپنے کو شہر کے اندر پہنچایا۔ حالانکہ ازسر زر ادھر سے بھی توپ تفنگ کا مینہ برستا رہا مگر فوجِ انگریزی کچھ خیال میں نہ لا کر بے دھڑک شہر میں داخل ہوئی۔ شجاعت و سینہ زوری میں نامور کامل ہوئے۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی پھر تو کالوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مرنا مارنا بھول گئے کالوں کی کالی دلی دیکھ کر بجز فراری ان کو کچھ بن نہ آیا کالا منہ کر جنگ

دکھلایا۔ گوروں نے شہر میں پہونچتے ہی ہر کوچہ و بازار میں خون کا مینھ برسادیا، طوفانِ نوح کو شرمادیا۔ جو باغی یا شہر کا حاجی بر وآیا سنگین سے بہ فرشِ زمین سلایا۔ اس طرح تین چار روز تک قتلِ عام رہا۔ شہر کے لوٹنے کا حکم لاکلام رہا۔ ہزار ہا کالے راہِ فرار بنا کر بے ارادۂ عبورگی بہ دریائے جمن غرق آب ہوئے۔ پانی پانی ہوکر ایک ایک داخلِ جہنم و عذاب ہوئے۔ بعدہٗ افواجِ سرکاری نے علاوہ از لشکریانِ غنیم ایک ایک ادنیٰ و اعلیٰ شہر کو ہاتھ پکڑ پکڑ کے شہر سے باہر ڈالا سب کو دیا دیس نکالا۔ پھر رفتہ رفتہ مہینوں تک تخت دہلی کا رشکِ گلشن تھا ایسا بادِ صرصر تاخت و تاراج سے پُرخزاں ہوا کہ جس کا شہرہ تا بہ آسمان ہوا۔ ہزار ہا بدمعاشانِ شہر آشوب نے محاذِ کوتوالی پھانسی پائی۔ بارِ اعمالِ افعال اپنی سے گردن جھکائی۔ اس انقلابِ زمانہ سے صد ہا کس و ناکس مالِ مفت کی مطلع غبارِ دہلی کا سرکارِ عالی وقار نے بعد چار پانچ مہینے کے عقلِ رسا و فہمِ ذکا اپنی سے ایسا صاف فرمایا کہ لفظِ تحسین و آفرین فرشتوں کی زبان پر آیا اور پھر وہ بھی اجالا عدل و انصاف کا بدستورِ سابق تمامی ملک محدوسہ میں کر دکھایا۔ مصرع ؎

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

حقیقت یہ ہے کہ سرکار کی خوش اقبالی نے اپنا کام کیا اور ہندوستانیوں کی بداعمالی نے اپنا نام تمام کیا۔ ورنہ سرکار کو یہ کب منظور تھا کہ پشہ بھی ہمارے زیرِ پا آجاوے یا کسی طرح کا دکھ اٹھاوے۔ اہلِ ہند نے جیسا کیا ویسا پایا اپنے کو مفت میں بدنام کر کے خاک میں ملایا۔ سب سے زیادہ بادشاہِ دلی و سلسلہ طینمان وارا کینان ان کے کہ چراغِ عقل و فہم ایسے گل ہوگئے کہ دن کو رات کہنے لگے۔ کالوں کو اپنے دین و ایمان کی روشنی دینے لگے۔ نہ سمجھے کہ یہ تیرہ بخت چند روز کی چاندنی دکھائیں گے پھر اندھیرا جگ میں کر جائیں گے۔ ان کے ساتھ آپ بھی شامل ہوکر تھوڑے دن کے واسطے اپنے کو لال بنایا پھر سیاہی کا ٹیکہ منھ پر لگایا اور مزہ اس لالی کا خاک نہ پایا۔ اس ایام میں یہ مطلع کسی استاد کا ان بے سروسامانوں کے حسب حال تھا۔ لن ترانی سے ہندو مسلمانوں کا عجب احوال تھا۔ مطلع ؎

نصیحت کے نہیں پابند ناصح ہم سے سودائی
طبیعت پختہ مخزوں کی جدھر آئی اُدھر آئی

گر ایک متنفس بھی از اہلِ قلعہ وار دِ ہوئینِ شاہی کمرِ ہمت و فرزانگی باندھ کر پہاڑی پر حاضر ہوتا تو نام سلطنتِ ہند کا کیوں کھوتا بلکہ ایک کے سبب سے ہزار کی بات قائم رہ جاتی تو پھر کس ہم رازی کو قلعہ والوں کے حق میں کچھ نہ بات آتی مگر افسوس صد افسوس کہ جو شدنی تھا وہی بالضرور ہوا مفت بر باد نام و نشانِ تیمور ہوا۔ خدا جانے یہ لوگ کیا سمجھے۔ خود اچھے ٹھہرے صاحب لوگوں کو برا سمجھے۔ مطلب کی بات ہے ہائے ہندو مسلمان کی سمجھ میں نہ آئی۔ افراطِ تقریظ نے عقل و ہوش ان کے کھودیے۔ ذلت دلوائی اسی واسطے بہتر ہے کہ کنجِ تنہائی اور بارِ الٰہی دنیا ایک راہ گزر ہے درپیش ہر دم سب کو سفر ہے۔ تا زیست انسان ہزار ہا جھگڑے و خلجان میں پھنسا ہوا ہے بعد از مرگ باز پرس کا بروز حشر ڈر لگا ہوا ہے۔ پس کسی طرح بشر کو دونوں طرف سے جائے مفر نہیں۔ کون سا نفع ہے جس کے سودے و تلاش میں اس کو ضرر نہیں۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ بہر حال عنایت ایزدی اور اپنی قسمت کے لکھے پر قانع ہو، شکر نعمت و رحمت و معبود کا کر کے نفس امارہ کو حرکت بد سے مانع ہو۔ شعر ؎

کسی کی مرگ پر اے دل نہ کیجیئے چشم تر ہرگز
بہت سے رویئے ان کو جو اس جینے پہ مرتے ہیں

جس وقت مردمانِ دہلی کو از ادنیٰ تا اعلیٰ افواج مفتوحہ نے شہر بدر کیا اس وقت کا حال پر ملال خرابیٔ اعمال ان کا لا بیان ہے۔ اب تک زبان خاص و عام پر الاامان ہے۔ یعنی اس نادیدنی کو دید کر کے زمین نے دانت میں تنکہ لیا۔ فلک نے نہ شنیدنی کو شنید کر کے خوف سے منہ اپنا ابر میں چھپا لیا۔ وہ وہ جوان خوش طلعت و باغ و بہار مصروحی امیر کبیر و سردار چہ از اہل قلعہ و چہ از سکان شہر گلزار کہ جن کو فرش گل پر قدم رکھنا عار تھا پیادہ پائی سے خارستان طے کرتے جاتے تھے۔ ان کو چشم اشک بار سے دیکھ کر آبلہ دل پھوٹ کر منہ کو آتے تھے اور وہ مہوشان حور نشاں رحم دل ریشاں کہ جو چودھویں رات کے چاند کو شرماتی تھیں اندھیرے گھر کا اجالا کہلاتی تھیں ان کی تیرہ بختی کے باعث فلک نے صحرا نوردی دکھائی ہزار ہا کی فنا ای

روز نائیں حیلہ آئی باقی جو بصد جاں کاہی وحالتِ تباہی جانِ بہ سلامت لے گئیں ان کی متاعِ آبرو پنجۂ غارت گراں سے دست بہ دست تخت وتاراج ہوئی۔
زندگی بدتر از مرگ ہوکر ان کے حق میں قیامت آج ہوئی۔نظم ؎

جھونکا خزاں کا آہ جوشن سے نکل گیا
ہر مرغ تپش کھا کے چمن سے نکل گیا
اے عشق سب یہ تیری ہیں خانہ خرابیاں
یوسف سا جو عزیز وطن سے نکل گیا

اس ہنگامۂ محشر کو دیکھ کر صد ہا برس کے لوگ عمر رسیدہ جہاں دیدہ آج تک کہتے ہیں کہ ہمارے طولِ عمر میں ایسا برا وقت کبھی چشمِ فلک نے نہیں دکھایا اور نہ کسی تواریخ کی رو سے سننے میں آیا۔ اللہ غور کر کے جو قدرتِ قادر کو دیکھا تو پھر عقلِ دور اندیش نے بھی پایا کہ اہلِ ہند کا کیا ان کے آگے آیا۔ کیا معنی ابتدا میں بے ساختہ خونِ ناحق بے چارگانِ زن و بچہ انگلستان کا تیغِ بے دریغ سے بہا کر خون بہا اس کا اپنے سر پر لیا اور نام جہاد وثواب بے بنیاد کا بدیں خود خلافِ شرع کیا۔ کس واسطے کہ قتل کرنا زن و بچہ کا ہنگامۂ جہاد عند الشرع میں بہت ممنوع آیا ہے اور اس کا ثمرہ کسی نے شجرِ حکمِ الٰہی سے نیک نہیں پایا ہے۔ پس یہی خون ریزی انجام کو وبالِ گردنِ ہندوستانی کے ہوگئی۔ بال بال بندھوا کر سرخ روئی نام ونشان کے کھوگئی۔ غزل ابوظفر بادشاہ دہلوی ؎

اگرچہ عقل سے الٹے ہزار دفتر کو
پلٹ سکے نہ کسی کے کوئی مقدر کو
مٹا سکے نہ کوئی سرنوشت کا ایک حرف
ہزار پٹکے اگر سنگ پر کوئی سر کو
جہاں دکھائے تماشہ ظہورِ قدرتِ حق
نہ واں فلک کو ہے طاقت نہ تاب اختر کو

محال ہے کہ رہے ایک طرح پر یہ جہاں
کہ روز دور نیا ہے فلک کے ساغر کو
گئے جو اور کے در پر وہ در بدر ہیں خراب
ظفرؔ نہ چھوڑیو تو آستانِ حیدر کو

قصہ کوتاہ بہ تلافی اعمال ہندوستان کثیر الاختلال کے پھر یہ حکمِ الٰہی خوب خس و خاشاک سے دہلی کی ہوئی صفائی مدت تک مسماری مسکنِ باغیان نظر آئی۔ اب ہر چند کہ بہ تجویز و ترکیب سرکار وہ خطہ از سرِ نو پر بہار ہے اور اس سے زیادہ لالہ زار ہے لیکن کیفیت رنگا رنگِ سابق کا میسر آنا دشوار ہے۔ بلکہ اس گلِ گلزار خوبی کی جا نظر آنا جاری ہے۔ بہ مصداق ایں کہ شعر

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غُل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
کہے تھا باغباں رو رو یہاں غنچہ تھا یاں گُل تھا

غرض کہ بعد از فتح سرکار و شکست فاش باغیان نہنجار اس مؤلف بے کار نے کہ مدت سے بہ گردش طالع نہ مددگار گرفتار تھا درخواست روزگار کی ان صاحبان عالی دودمان موجودہ میرٹھ سے کی کہ جن کا ذکر تشریف آوری اوپر آیا ہے خامۂ دو زبان نے بہ تعداد صفت حمیدہ ان کا رقم فرمایا ہے چنانچہ وہ سب صاحب اس وقت تک بمقام میرٹھ رونق بخش ہو کر اوپر حال شکستہ بال اس عاصی کے شب و روز الطاف کرم اپنا مبذول فرماتے تھے۔ متوقع دستگیری کا ہموار کئے جاتے تھے۔ انہوں نے بصد اخلاق و مہربانی و بذار توجہ روحانی ایک چٹھی معہ خود بحق بندۂ رنجور پیش گاہ حکام حال ضلع میرٹھ و دہلی سے فرمائی کہ اس سے چشم زدن نے مراد اس نامرادی بر آئی اول بذریعہ چٹھی مسٹر ولیم لیت [illegible] صاحب بہادر مشنری [illegible] اپنے کو بہ خدمت مسٹر براندس صاحب ریذیڈنٹ دہلی سے پہنچا انہوں نے حال [illegible] سن کر بہ [illegible] ولیم فورڈ صاحب بہادر کلکٹر مجسٹریٹ ضلع گوڑگاؤں سے فرمایا۔ صاحب ممدوح نے قریب دو سہ ماہ خدمت پولیس میں بمقام ریواڑی[28] نامور کیا بعدہ متوقع پرورش [illegible]

بالضرور کیا جو کہ کلکٹر صاحب ممدوح بسا اعلیٰ ہمم و مجسم کرم اور اپنے قول پر ثابت قدم تھے چند عرصہ کے بعد ایفاً وعدہ فرمایا۔ مؤلف کو بعہدۂ اسسٹنٹ گرداور محکمۂ پرمٹ میں کہ اس ایام میں یہ اختیار بھی رکھتے تھے برسرِ ترقی پہونچایا۔ اس روز سے تائیں دم کہ عرصہ پانچ برس کا بیش و کم گزرا یہ عاجز دو قرص نانِ گندم صاحبِ موصوف کا نہایت شکر گزار ہے۔ یہ دوگانۂ شکرانہ پروردگار جہاں و دعائے دولت اس حاکمِ قدر دان مصروفِ لیل و نہار ہے مگر اس عرصہ میں اٹھارہ ماہِ نومبر کو یکا یک گلزارِ آرزو اپنی میں خارِ حسرت و غم نظر آیا بعدِ خزاں تقدیر نے اور نیا گل کھلایا کہ جس سے آج تک تختۂ دل حزیں کا داغ دار ہے رشکِ افروزی لالہ زار ہے۔ مطلع ؎

اے لالہ گر فلک نے دیے تجھ کو چار داغ
سینہ مرا سرا ہے اک دل ہزار داغ

حاصل اس کا یہ ہے کہ برادر عزیز وافر تمیز جان کو پیش نے کہ بہ حالت خانہ نشینی محمد شاہ وقت تھا اور فیض و کرم میں سکندر بخت تھا۔ ناگاہ بہ دردِ شکم اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔ آسمان ہم پر ٹوٹا۔ زمین زیرِ پا سے نکلتے نظر آئی اس روز سے عجیب حال ہے۔ زندگی وبال ہے قیدِ دنیا جی کا جنجال ہے۔ بقول شخصے ؎

زندگی گر عذاب ہے تجھ بن
موت بھی تو خراب ہے تجھ بن

گویا بال و پر تمنا کے سر پر سے شکستہ ہوئے دل و جان مجروح حسرت و ارمان خراب خستہ ہوئے۔ ہر چند کہ بے آئے ہوئے کون مرتا ہے و لے حکمِ حاکمِ حقیقی دم اجل کون بھرتا ہے۔ اپنا حظِ زندگی اس دن سے بالکل مفقود ہے۔ برابر اپنا عدم وجود ہے خوشی جس کا نام ہے وہ اپنے کلبہ احزاں سے کوسوں دور ہے۔ ہاں البتہ غم کی مہمانی شب و روز دلِ غم زدہ کو بہ دلِ منظور ہے۔ آرزو ہائے دنیاوی کا اختتام ہے مگر انتظارِ مرگ صبح و شام ہے۔ غزل جرأت ؎

ہوئی غم میں تمام زندگانی
تھا رنج کا نام زندگانی

گر پختہ مزاج ہو تو سمجھو
ہے رشتۂ خام زندگانی

پیدا ہوئی جب ہی سے لاسعی
مرنے کا پیام زندگانی

یہ صبح سے حال ہے تو کیونکر
ہوگی تا شام زندگانی

ہرگز نہ کرے سرائے تن میں
بے یار مقام زندگانی

یوں زیرِ فلک کرے یہی تجھ بن
صاحب یہ غلام زندگانی

جس شکل سے مرغِ نو گرفتار
کاٹے تہہ دام زندگانی

بہتر ہے غمِ فراق سے مرگ
سن لے یہ کلام زندگانی

بس مجھ سے تو ہاتھ اٹھا نہ تجھ کو
کرتا ہوں سلام زندگانی

اے جان نہ ہو جو تو پاس
آوے کس کام زندگانی

جرأت سے یہ سن بقول جامی
اے بے تو حرام زندگانی

ہنوز یہ ناسورِ جگر اندمال پر نہ آیا تھا، دست تدبیر نے مرہم اس کا نہ پایا تھا کہ ناگاہ 15 رجولائی 1861ء مسٹر فرانسیس کوئن صاحب نے باعث کہنی دنیائے دون کو پدرود فرمایا برکت ورونق خانہ فیض کاشانہ اپنے کو یک قلم اٹھایا اگرچہ مرنا سب کو برحق اور جینا سب

یادِ الٰہی ناحق ہے و لے ایک امیر کا انتقال فرمانا چشمِ فیض کا بند ہو جانا ہے اور صدائے حسرت واندوہ کا ہر طرف سے آنا ہے کیونکہ صاحبِ مرحوم بھی اپنے دم قدم سے مجموعۂ سخا و کرم بالضرور تھے و ملک الشعرا بھی مشہور تھے مگر با ئیں ہمہ علم ودانائی نام ونمود دادِ الٰہی قبل از وفات دو سال اپنی کے تمامی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ از ان خود کہ قریب ایک لاکھ روپیہ کی تھی معہ چار دیہات دیگر عطیہ سرکارِ فیض آثار بدبختی بائی صاحبہ زنِ غیر منکوحہ اپنی بذریعہ وصیت نامہ مصدقہ عدالت فرما گئے۔ حق تلفی جمیں وابستگان اپنے کے کہ ہم کہ دس بارہ آدمی جی القائم ہیں فرما کران کو خاک میں ملا گئے۔ مطلع ؂

دل و دیدہ اپنے تھے آشنا سو وہ درد و غم میں پنہاں گئے
ہمیں جن سے چشمِ امید تھی وہی صاف آنکھیں چرا گئے

حالانکہ جملہ پسماندگان ان کے ہمیشہ سے مطیع و فرماں بردار بے چارہ و مبتلائے گردشِ روزگار تھے پر ان کو کسی پر رحم نہ آیا۔ سخت بے رحمی و سنگ دلی کو کار فرمایا کچھ خوفِ خدا و خیالِ عقبا دل میں نہ سمایا۔ سچ ہے کہ اس دہرِ خرابات میں کوئی کسی کے سنگ ساتھ ہے ہاتھ نہیں۔ سب ناطہ رشتہ منہ دیکھے کا مشہور ہے اور ظاہر پرستی کا زور ہے۔ شعر ؂

خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا
کوئی کسی کا نہیں دوست سب کہانی ہے

اس واسطے فقیروں، خدا پرستوں نے اس دنیائے خراب آباد بے بنیاد پر بھیج دی تبرّہ ہے جس نے اس کو ترک کیا وہی اس کا دوست ہر دو عالم سے مبرّا ہے۔ خدا گواہ وکفی باللہ شہیدا کہ مغیاں اس حق تلفی وتباہی لواحقان وقدرت خلاقِ جہاں یہاں تک خیش و بیگانہ کو رنج و افکار ہے کہ جس کی شہرت ہر شہر و دیار ہے۔ چشمِ فلک کو بھی اشک باری لیل ونہار ہے۔ یہ مقولہ استاد کا حسبِ حال زار حق داران دل افگار ہے۔ مطلع ؂

گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اے بے حکمِ الٰہی کیا ہوتا ہے، انسان اپنی بے صبری سے اپنے کو کھوتا ہے۔ ہر چند کہ اس درد کی

دواچند در چند شہنشاہِ وقت یعنی حکام والا مقام سے چاہی اور وارثانِ صاحبِ مغفور نے اپنی بےکسی دکھائی۔ انجام کو بہ ملاحظہ وصیت نامہ نوشتہ ان کے سب انصاف سے مجبور رہے۔ پابندِ آئین وقانون انگلشیہ بالضرور رہے۔ آخرالامر صبوری ضروری کو کیا گیا اور اپنی بے بال وپری سے کچھ نہ دیکھا چارہ۔ خواہشِ تقدیر ورضائے قادرِ تقدیر کے آگے دم نہ مارا۔ شعر ؎

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر ساری عمر کوستے رہے

اگرچہ رزاقِ مطلق کُل ذی حیات کا وہی ایک پروردگار ہے۔ ادنیٰ واعلیٰ کا دستگیر ومعاون کار ہے۔ چنانچہ یہ مؤلف بھی بہ فضل وکرم اس کے نان ونفقہ سے بہ زور دست وبازوئے خود مسرور ومشکور لیل ونہار ہے۔ الّا جب کبھی جائے گفتِ خلاق کا خیال آتا ہے یہ کوئی حرفِ شومئی ایام کا اندر بابک کسی کی نسبت سناتا ہے تو ہر ایں بہ مقیضائے بشریت حسرت ویاس دامن گیر ہوتی ہے۔ خارکلفت تختۂ دل میں بوتے ہی اس وقت یہ اشعار مرزا رفیع السودا و میر سوز حسب حال اپنے خاکسار کو یاد آتے ہیں۔ پڑھ کر دل مضطر کو سمجھاتے ہیں۔ سودا ؎

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں
گریاں بہ شکل شیشہ وخنداں بہ شکل جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں و بقول درد
جو کچھ نہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

میر سوز ؎

اے اہل بزم میں بھی مرقع میں دہر کے
تصویر ہوں ولے لب حسرت گزیدہ ہوں
صیاد اپنا دام اٹھالے کہ چوں صبا
ہوں تو چمن پہ گل عشرت چکیدہ ہوں

غم ہوں الم ہوں درد ہوں سوز و گداز ہوں
ہاں اہلِ دل کے واسطے میں آفریدہ ہوں

الا حاصل جس طرح خدائے کریم رکھے بحر حال و احوال اس کے شکر و سپاسِ بے قیاس کا مقام ہی زندگی اگر تندرستی سے بسر ہو تو ہزار نعمت و دولت ایک طرف اس کا احسانِ بیکراں صبح وشام ہے کس لئے کہ حشمت، ثروت بہت ناچیز ہے۔ قناعت خدا کی راہ میں بڑی چیز ہے۔ جس کے ہاتھ دامنِ توکل آ گیا ہے وہ نعمتِ غیر مترقبہ دونوں جہان میں پا گیا ہے۔

جس طرح کہ صاحبانِ انگریز بہادر نے اس کارساز پر توکل و نیاز رکھ کر دامنِ کوہِ دہلی تا فتح پچھواڑہ تب اس کی قدرت و ان کی جرأت اور ہمت سے غنیم نے منہ موڑا۔ باوجودیکہ پانچ مہینے تک ایک زمانہ اپنی بےصبری سے ان کا دشمنِ جانی ہو گیا پر ان دانشمندوں و برگزیدوں کے صبر و تدبیر سے رفتہ رفتہ وہ پھر فضلِ ربانی و عملِ انگلستانی ہو گیا۔ القصہ جس صورت سے اس شہنشاہِ گیتی پناہ یعنی صاحبانِ والا جاہ کے مطلبِ دلی حصول ہو کر فتح دہلی خدا نے دکھائی اور ہندوستان کے خس و خاشاک کی ہوئی صفائی، اسی روش اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کل عالم و عالمیان کی مراد و تمنائے دلی برلاوے خصوصاً سامعین و ناظرین وقائع ہٰذا کی خواہش اور مؤلف کی آرزو از برکت و کرم حضرتِ مسیح برآوے۔ آمین رب العالمین۔

خاتمہ کتابِ لاجواب

یہ بات خاص و عالم میں مشہور ہے کہ اردوئے معلّٰی کا لکھنا مشکل ضرور ہے۔ نظر برآں فسانۂ عجائب کے مصنف نے جو کچھ حق اس زبانِ خوش بیان کا ادا فرمایا ہے اس کی ہمسری میں آج تک کسی نے رتبہ نہیں پایا ہے۔ چوں دریں آیام نیک انجام راقمِ وقائع ہٰذا کو بھی جو دو چار مرتبہ اتفاق سیر اس سانحۂ عجیب و غریب کا ہوا تو شیریں زبانی و محاورہ دانی اس زباں داں کے نہایت پسند آئے۔ طبیعت کی رقبت اس کی بول چال پر بہت پائی۔ اس واسطے اول اس استادِ وقت کی شاگردی کو غائبانہ قبول کیا تب اس کتاب کی تحریر کا نام لیا۔ یقینِ کامل ہے کہ اب جس ناظرین کی نظر سے یہ گزر جائے گا اول وہ لطفِ کلام حاصل فرمائے گا من بعد سانحۂ غدر پڑھ کر دل اس کا خوفِ خدا پر رجوع لائے گا۔ ظاہر ہے کہ بہت

کتابیں حالات و مقالات غدر کے جس جس صاحبان پر آفت و صعوبت گزری ان کی جانب سے مطبع ہائے آگرہ وغیرہ چند شہر و دیار میں حلیہ تباہ کا پہن کر مطالعہ و ملاحظہ شائقین میں در آئیں مگر اس کے طرزِ تقریر و عبارت دل پذیر کے خوبیاں ان میں کہاں پائیں صرف سیدھی وسادی حکایتیں و روایتیں دیکھنے و سننے میں آئیں۔

لہٰذا مصنفوں سے داد کا طلب گار ہوں جا و بے جا کے اصلاح کا امیدوار ہوں۔ شائق اس کو جب پڑھیں گے دیگر کتاب ہائے سوانحۂ غدر کو طاق میں دھریں گے۔ بلکہ غالب یہ ہے کہ اگر مرزا رجب علی سرور بھی ایک نظر اس کو ملاحظہ فرمائیں گے بہ چشمِ انصاف آفریں کہتے کہتے تھک جائیں گے۔ بہت جان و دل کو اس نسخہ کی فکر میں گنوایا ہے تب یہ مضمونِ پسندیدہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقاتِ عزیز کو کچھ فضول و بے کار نہیں کھویا ہے بلکہ گلدستۂ پر بہارِ معنی کو گلشنِ سخن میں اچھی روش پر بویا ہے۔ پس در بہ ضرورت و سیرت جس طرح سے بذریعہ احباب و قدردانِ عالی جناب اس کی شہرت ہوگی پیش کو در پیش مسرت ہوگی اور ان کے برحال مؤلف مزید عنایت ہوگی۔

اشعارِ تاریخ از مؤلف کتاب

جب یہ قصہ تمام ہوا اور مشہور و معروف بہ خاص و عام ہوا تو پہلی فکر تاریخ اس کی بہ طبع مؤلف در آئی۔ دریں ضمن ہاتفِ غیب یہ ندا یک بیک پہنچائی قطعہ تاریخ

لکھا پیش صاحب نے احوالِ غدر
مشہور ہوئے مطلب کو شائق فہیم
پڑھے جو کوئی غدر کی سرگزشت
کرے دل میں وہ خوف ربِ کریم
خبر دیتی ہے غدر کی یہ کتاب
ہوئی اس کی تاریخ مجز عظیم
1862ء

تاریخ از نتائج طبع صاحب حمیدہ خصال ملک الشعرا بے مثال عنایت فرمائے۔

بندۂ نیاز اعمالِ منشی ہر گوپال تفتہ سکندر آبادی سلمہٗ اللہ تعالیٰ ۔

خواہی کہ چہ زماں وقائع ہند خوشاب
بو دست بلا وقائع ہند خوشاب
بہ تفتہ نشین و عیسوی سال خوشنو
حیرت افزا وقائع ہند خوشاب

قطعہ تاریخ از مظفر علی صاحب متخلص بہ راقم متوطن قصبہ کلیانہ پرگنہ دادری علاقہ راجہ صاحب والی جند ۔

بگفتا پیش صاحب چوں کتابِ نو بہ طرزِ نو
پسندِ خاطرِ ادنیٰ و اعلیٰ حرف حرف آمد
بہ بزمِ لفظ پر دازاں معنی سنج اے راقم
عروسِ سالِ تاریخش تواریخ شگرف آمد
1862ء

سبحان اللہ یہ کیا دلچسپ کہانی ہے۔ فرحت افزائے جسمانی وعبرت نمائی روحانی ہے۔ موسومہ وقائع حیرت افزا ہی گویا اسم بہ مسمّیٰ ہے۔ کاتبِ زمانہ اپنی اسی طرز پر اردو کہلاتے ہیں ولیکن اس بول چال جادو مثال کا کہاں مزہ پاتے ہیں بلکہ سن کر منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ مصنف اس کا بلبلِ ہزار داستان گلزارِ معنی ہے۔ طوطۂ خوش الحان مست خندانی ہے۔ فکرِ رسا اس کے بہ قلم کا بہ کلام بہت دور ہے۔ اپنی قوم میں بہ علمِ فارسی مشہور ہے۔ فریدی برآں زبانِ عربی میں بھی اس کی طبیعت کو زور ہے۔ نام جارج پیش دلربیش تخلص شور ہے۔

جس دم کہ یہ داستان حیرت بیان چھاپے میں چھپے گی ہاتھوں ہاتھ لے جائیں گے۔ گوہرِ جان و دل کو اس کی رونمائی میں دے جائیں گے۔ واضح ولائح ہو کہ آخری ماہِ ستمبر 1862ء کی 30 تاریخ روز سہ شنبہ بہ مقام اسسٹنسی پرمٹ بسانہ دیہہ و برانہ ضلع جھانسی اختتام اس کا بخیریت تمام ہوا جس نے دیکھا و سُنا مسرور لا کلام ہوا۔

پہنچنا شہرت اس وقائع کی بادِ صبا سے تا بہ آگرہ اور اشتیاق دید و دید کو گلہائے تروتازہ اس کے بہت جلد ذریعۂ احباب طبع ہو جانا اور نام پانا جس وقت کہ نوید فرحت شدید اختتام اس گلدستۂ باغِ سخن کے شدہ شدہ تا بہ گوش و ہوش مسٹر آر کمینڈس کانسٹین صاحب سر دفتر انگریزی کلکٹری ضلع آگرہ و ہم رئیس انجانسیم سحری نے پہونچائی۔ غائبانہ طبیعت ان کی اس کی سیر کی طرف بہ شوقِ پر ذوق راغب و مائل ہو آئی۔ کس واسطے کہ صاحبِ موصوف اس دیارِ گلزار میں مجسم اخلاق و علم انگریزی، فارسی، و شاستری میں بہت مشاق ہیں۔ علاوہ اس کے طبعِ رنگین و فکرِ متین بھی رکھ کر شگفتہ فرمائے۔ غنچۂ دلِ دوست داران ہیں مجموعۂ خوبی ہائے بیکراں ہیں۔

مزید برآں مؤلف کے برادر ہیں۔ بہ عالمِ محبت و مروت ظاہر و باطن رکھتے برابر ہیں۔ گلِ گل بن نشاط اگر ان کو کہیئے تو بجا ہے۔ بلبلِ چمنِ انبساط لکھیے تو روا ہے۔ بقول شخصے

گل و بلبل بہار میں دیکھا

ایک اس کو ہزار میں دیکھا

خُلق و اخلاق سنتے ہیں جس کو ہم نے اس وضع دار میں دیکھا۔

چنانچہ حزب الطلب صاحبِ موصوف کو اول بہ مقصد اختتام پا کر بہ خدمت ان کے ارسال ہوا ان کو اس کے مطالعہ کا شوق کمال ہوا بعد اس کے بہ توجہ آں متوجہ حال حمیدہ خصال شہر آگرہ میں بہ مجلہ .... مطبع .... در ماہ .... 18ء بہ .... سرعت سریع طبع ہو کر سواد اس کے سرمۂ چشم حقیقت ناظرین ہوئے۔ بہ ایک شائق کی زبان سے مشہور آفرین ہوئے۔ پھر تو طالب اس کے مانند مطلوب کے دست بہ دست لے گئے۔ نقد دل اس پر نثار کر کے دے گئے۔

فقط

تمام شد و حسن انجام شد

حوالہ جات

1- فرانسس کوئن فرآسو بیگم سمرو کا درباری شاعر تھا۔ وہ جرمن نسل سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی والدہ مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ فراسوا ردو کا پہلا انڈو جرمن شاعر تھا، انہوں نے بھی 1857ء کی منظوم تاریخ ''فتح نامۂ انگریز'' تصنیف کی تھی۔

2- ہر چندر پور گاؤں میرٹھ باغپت روڈ پر واقع ہے اور پرگنہ کھیکڑا میں آتا ہے۔ یہ حویلی آج بھی خستہ حالت میں موجود ہے۔

3- باغپت اب مغربی اتر پردیش کا ایک ضلع بن چکا ہے جبکہ بڑوت کو تحصیل کا درجہ حاصل ہے۔

4- کاٹھ باغپت سے تین کلومیٹر دلی شاہراہ پر واقع ایک تاریخی گاؤں ہے جہاں مغل بادشاہ شکار کھیلتے تھے۔ مرزا غالب کے شاگرد عین الحق کاٹھوی کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔

5- کھیکڑا باغپت کا ایک پرگنہ ہے۔ دلی سے ہر چندر پور جانے کے لئے کھیکڑا راستہ میں پڑتا ہے۔

6- جان کوئن پیش شور کے چھوٹے بھائی تھے جو اپنے نانا کے یہاں رہتے تھے۔

7- شاہ مل جاٹ بجرول کا زمیندار تھا اور انقلابیوں کی قیادت کر رہا تھا۔ انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہوا اور گاؤں میں اس کے مجسمہ پر آج بھی پوجا کی جاتی ہے۔ ہندی میں اس انقلابی پر بہت سی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

8- کرم علی تحصیلدار بڑوت کو 1857ء میں انگریزوں کا ساتھ دینے پر نواب کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ نواب کوکب حمید ایم ایل اے اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

9- پابلی باغپت ضلع کا مشہور گاؤں ہے۔ ہر چندر پور سے میرٹھ جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

10- بالینی جانی کے قریب میرٹھ باغپت روڈ پر واقع ہے۔ ہنڈن ندی کے پاس کا

علاقہ ہے۔

-11 نبالی، یہ گوجروں کا گاؤں ہے۔

-12 متیلی، ایک گاؤں جواب باغپت ضلع میں ہے۔

-13 ریواڑی بڑکہ، یہ مشہور گاؤں ہے جہاں اسی علاقہ کے مردِ مجاہد شاہ مل جاٹ کا قتل کیا گیا تھا۔

-14 کاسگنج پہلے ایٹہ ضلع کا ایک قصبہ تھا جسے اب ضلع کا درجہ دے دیا گیا ہے اور کانشی رام نگراس کا نام رکھا گیا ہے۔

-15 نجتی بائی۔ فرانس کو ئن فراسو کی غیر منکوحہ تھی۔ فراسو نے انتقال سے قبل اپنی وصیت میں تمام جائداد نجتی بائی کے نام لکھ دی تھی۔ نجتی بائی کے انتقال کے بعد ہی جارج پیش شورا اپنے نانا کی جائداد کے مالک بن گئے۔

-16 جان پیش جارج پیش شور کے والد تھے جو علی گڑھ کے محلہ ماموں بھانجہ میں رہتے تھے۔

-17 پیڈروں ایک فرانسیسی جنرل تھا، اس کی حویلی علی گڑھ کے پیڈروں گنج میں تھی جو اب پدروں گنج ہو گیا ہے۔ یہ علاقہ علی گڑھ شہر میں بارہ دری اور ریلوے روڈ کو ملانے والی سڑک پر واقع ہے جہاں اس حویلی کے نقش ونگار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

-18 الہ آباد اور کانپور کے درمیان ایک مشہور شہر فتح پور۔

-19 شیخ خوش وقت علی گڑھ کے زمیندار تھے اور اترولی کے نزدیک موضع سہنول میں ان کی حویلی کا دروازہ آج بھی موجود ہے جہاں جارج پیش شور کے خاندان نے پناہ لی تھی۔

-20 کوکس 1857ء میں علی گڑھ کے ضلع مجسٹریٹ تھے۔

-21 اصلی نام مولوی تسلیم اللہ۔ مجاہدین کے قافلہ سالار علی گڑھ کو انگریزوں کے قبضہ سے نجات دلائی اور 19 اکتوبر 1857ء کو شہید کردئے گئے، جامع مسجد علی گڑھ

میں مزار۔

22- ٹھاکر کھڑک سنگھ، انگریزوں کے وفادار، مولوی عبدالجلیل سے لڑتے ہوئے زخمی بھی ہوئے۔

23- چوبے گھن شیام داس سرسید کے دیرینہ رفیق راجہ جے کشن داس کے بڑے بھائی۔

24- راجہ جے کشن داس سرسید کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے سلیمان ہال میں جے کشن داس ہوسٹل انہیں کے نام سے ہے۔

25- کول، علی گڑھ کا قدیمی نام اور اس ضلع کی صدر تحصیل آج بھی کول کہلاتی ہے۔

26- قلعۂ آگرہ اس زمانے میں انگریزوں کی پناہ گاہ بن گیا تھا اور سارے انگریزوں کو ہنگامے کے دوران وہیں رکھا جاتا تھا۔

27- برائلے۔ علی گڑھ کے ضلع مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے۔

28- ریواڑی۔ ہریانہ کا ایک مشہور علاقہ ہے جہاں شور ملازم تھے۔

باب چہارم

جارج پیش شورؔ کی شاعرانہ عظمت

فرانسیسی نسل کے جارج پیش شورؔ انیسویں صدی کے ان ممتاز ترین شعرائمیں سے تھے جنہوں نے اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا مگر بدقسمتی سے ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی کسی ادیب، شاعر، صحافی اور محقق نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کو ہندوستانی ادب میں کوئی جگہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ادب میں انہیں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکا جب کہ ان کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان کا شمار استاد شعرائمیں کیا جاتا تھا۔ لالہ سری رام، مالک رام اور بہت کم تذکرہ نگاروں نے ہی ان کے حالاتِ زندگی اور شعری کمالات کے بارے میں لکھا ہے۔

لالہ سری رام نے خم خانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ ''شاعری کا شوق اس درجہ تھا کہ کسی وقت فکرِ سخن سے فارغ نہ رہتے تھے۔ ہندی زبان کی بھی مہارت رکھتے تھے چنانچہ ان کی اکثر ٹھمریاں اور ہولیاں مشہور ہیں، اردو میں صاحب تصانیف گزرے ہیں۔ چار پانچ اپنی زندگی میں ہی چھپوا کر شائع کر دے تھے۔ ہر دیوان جناب داغؔ دہلوی کی ہم طرح غزلوں سے معمور ہے۔''

داغؔ سے شورؔ کے معاصرانہ تعلقات تھے بلکہ ان کا پانچواں دیوان گلزار داغ در آفتابِ داغ کے جواب میں لکھا گیا ہے اور انہیں کے رنگ میں ہے۔ شورؔ کی خواہش تھی کہ وہ داغؔ سے بڑھ جائیں اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ان کا شمار ملک کے ممتاز ترین استاد شعراء میں کیا جائے۔ شورؔ نے چند قطعوں میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً

تمہارے شور سے ہوں شوؔر کیوں حسود نہ داغؔ
کہ فنِ شعر میں ہو تم بھی سر بلندوں میں

سن کر کلامِ شوؔر بھڑک جائے داغؔ بھی
انصاف اس کے دل میں سمائے ذرا سی دیر

مقابل داغؔ کے کچھ اور لکھ شوؔر
تری جودت طبع اب تو بڑی ہے

جارج پیش شوؔر کو حضرت داغؔ دہلوی کی طرح اردو شاعری میں وہ مرتبہ تو حاصل نہیں ہوسکا مگر زبان و بیان پر انہیں ضرور قدرت حاصل ہوگئی۔ اردو کے ساتھ ساتھ شوؔر کا فارسی اور ہندی کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ ان کی تصنیفات میں اردو کے چھ دیوان اور ایک مثنوی (سوانح عمری) ایک دیوان فارسی کا اور ایک نثری کارنامہ ''وقائع حیرت افزاء کے نام سے شامل ہیں۔ انہوں نے 164 صفحات کی ایک خوبصورت بیاض بھی چھوڑی ہے جس میں دوسرے شعراء کے پسندیدہ اشعار شامل ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تفصیل اس طرح ہے۔

(1) دیوانِ شوؔر (1872) مطبوعہ چشمہ علم بے خزاں پریس، میرٹھ
(2) دیوانِ شوؔر (78-1877) مطبوعہ مختار المطابع، میرٹھ
(3) دیوانِ شوؔر (1884) کچھ حصہ ہاشمی پریس اور کچھ حصہ محبِ کشور پریس میں چھپا
(4) دیوانِ شوؔر (1888) مطبوعہ پولیس پریس، میرٹھ
(5) ستارۂ شوؔر (1890) مطبوعہ جگت پریس، میرٹھ
(6) دیوانِ شمس شوؔر۔ دوسرا نام اس کا شورِ قیامت تھا۔ (1894) انتقال کے بعد شائع ہوا
(7) مثنوی مطبوعہ ہاشمی پریس، میرٹھ (1894) انتقال کے بعد شائع ہوئی
(8) گلشنِ فرنگ (دیوانِ شور فارسی) 1890ء شگوفہ پریس، میرٹھ

(9) نظم معرفت اول و دوئم (1889) ودیا درپن پریس، میرٹھ

(10) وقائع حیرت افزا (1862) غدر کے واقعات (غیر مطبوعہ)

دواوین میں مختلف استادوں کی غزلوں پر غزلیں کہی گئی ہیں۔ ان میں متقدین اور معاصرین بھی شامل ہیں۔ خمسے، قصائد، تاریخ ہائے وفات، سہرے کے علاوہ ہندی گیت، ٹھمریاں اور دادرے بھی موجود ہیں۔[2]

ان تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شور بہت زود گو تھے اور انہیں زبان وبیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے کلاسیکی شاعری کا بھی وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اکثر اشعار میں اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مختلف شاعروں کے پسندیدہ مصرعوں کو اپنا لیا ہے مثلاً:

قبول خاطرِ اہلِ سخن خدا داد ست
بجا ہے شور یہی، خوب کہہ گیا حافظ

سچ ہے بقول غالب شیریں کلام شور
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

شور نازاں نہ ہو ہستی پہ بقول غالب
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

لکھا تقدیر کا اے شور بقول انشاء
ہم گھٹا سکتے ہیں ہرگز نہ بڑھا سکتے ہیں

ہے زیست تیری شور دو روزہ بقول ذوق
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یہی وجہ ہے کہ شوؔر کے کلام میں مختلف عہد میں، مختلف شعراء کا اثر غالب ہے۔ اس میں سودا، میر، درد، انشاء، ظفرؔ، غالب، رند، مومنؔ، آتشؔ، قلقؔ، نصیؔر، ناسخؔ، وغیرہ سبھی استاد شعراء کے اندازِ بیان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مگر داغؔ کے مقابلے کی وجہ سے داغؔ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ انہیں خود بھی یہی رنگ پسند تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

شوؔر شیریں ہو بیاں، رنگِ سخن بھی ہو عیاں
یعنی جو نکلے تو بے ساختہ پن سے نکلے

شوؔر کہتے ہیں جسے بس کہ وہ شیریں سخن
ان دنوں میرٹھ میں ہر جا اس کا چرچا ہوگیا

شوؔر کے کلام کا خاص وصف اس کا بے ساختہ پن ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ موضوعِ سخن سے غافل تھے۔ کہتے ہیں ؎

اے شوؔر تم نے پائی ہے طبعِ رسا غضب
مضمون کی تلاش کرامت سے کم نہیں

ہیں شوؔر ہر ایک شعر کے پیچیدہ جو معنی
مضمون یہی کاکل پیچاں سے نکالا

جارج پیش شوؔر نے جن ممتاز شعراء کے انداز میں شعر کہے ان کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ شوؔر کی ادبی اور فنی حیثیت کو متعین کرنے میں آسانی ہو سکے۔

ظفرؔ:
کب بنائے سے بنی ہے کوئی تدبیر کی بات
بات وہ ہی ہے کہ جو بات ہے تقدیر کی بات

شوؔر:
کس کو معلوم ہے قسمت میں ہے کیا کیا لکھا
پوچھیے کس سے بھلا کاتبِ تقدیر کی بات

قلق میرٹھی: کوچۂ غیر میں گزاری رات
ہوئی روزِ جزاء ہماری رات

شورؔ: تم نے ہنس کر وہاں گزاری رات
یہاں رو کر کٹی ہماری رات

آتشؔ: نظر آتا ہے مجھے اپنا سفر آج کی رات
نبض چل بسنے کی دیتی ہے خبر آج کی رات

شورؔ: صدقہ ہجر سے جاں کا ہے سفر آج کی رات
ملک الموت بھی آتی ہے نظر آج کی رات

جرأتؔ: نیرنگ محبت نے یہ اپنا تو کیا رنگ
دیکھے کوئی چہرہ کو تو ہر دم ہے نیا رنگ

شورؔ: تم بھی تو ذرا چل کے اسے دیکھو خبر لو
بیمار جدائی کا تمہاری ہے برا رنگ

غالبؔ: جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

شورؔ: ہزاروں وہاں شور کرتے ہیں سجدے
جہاں اس کا نقش قدم دیکھتے ہیں

میرؔ: زیست اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

شورؔ: عمر تعبیر خواب کی سی ہے
بلکہ صورت حباب کی سی ہے

مومنؔ: اوس پریوش سے اکتاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

شورؔ: اشک طوفاں دکھاتے ہیں مجھے

عین دریا میں ڈوباتے ہیں مجھے

ظفرؔ: صحبت گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی
آجکل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

شورؔ: ہے لگے باہم چٹکنے بلبل و غنچہ ہیں آج
آ گئی کچھ اس چمن میں پھر ہوا بگڑی ہوئی

ناسخؔ: رو رو کے داغ گنتے ہیں ہم ہجرِ یار کے
یہ قطرہ ہائے اشک ہیں دانے انار کے

شورؔ: رونے پہ مرے ہنس کے لگاتے ہیں قہقہے
زخموں پہ ڈالتے ہیں نمک دلفگار کے

منیرؔ: سواری تری آ کے کیا پھر گئی
اِدھر کی اُدھر کو ہوا پھر گئی

شورؔ: مریضِ محبت کی معلوم صحت
دوا اوٹھ گئی اور دعا پھر گئی

ذوقؔ: دشنام ہوکے وہ ترش ابرو ہزار دے
یہاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے

شورؔ: آبِ حیات سے بھی فزوں اس کو سمجھیں ہم
اک جام اپنے ہاتھ سے گر وہ نگار دے

شررؔ: ازل کے دن جو ہر اک درد کی دوا ٹھہری
تمہارے بوسۂ لب پر میری شفا ٹھہری

شورؔ: جو ایک بوسہ کا طالب ہوا میں ان سے کبھی
تو ہنس کے بولے کہ ہے خیر آج کیا ٹھہری

شورؔ کے مندرجہ بالا اشعار سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام فنی عیوب سے یکسر پاک اور استادانہ شان کا حامل ہے جس میں زور، روانی اور پختگی

پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں تصوف اور اخلاق کے مضامین کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ انسان دوست تھے۔ ہر مذہب کا احترام کرتے تھے اور بڑے وسیع المشرب انسان تھے، ہر مذہب وملت کے افراد سے ان کے تعلقات تھے۔ شور نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کے شعری مجموعوں میں تاریخی قطعات بھی ملتے ہیں، مسدس اور قصیدے بھی بے شمار ہیں۔ انہوں نے بچہ پیدا ہونے، شادی کے مبارک موقعہ پر سہرے بھی لکھے ہیں۔

وہ بڑے صاف دل اور صاحبِ مروت انسان تھے۔ وہ اپنے ایک شعر میں اپنی انسان دوستی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

زلف کافر کے خم و پیچ سے ہرگز خالی
شور ہندو نہ مسلماں نہ کرستان رہے

مرزا اسد اللہ خاں غالب سے بھی ان کے مراسم تھے اور جب غالب کا انتقال ہوا تو انہوں نے بھی اپنی شاعری میں گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے غالب کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ شور نے غالب کے انتقال پر چار قطعات تاریخ وفات کہے ہیں جس میں دو اردو میں اور دو فارسی میں۔ انہوں نے غالب کو ''چراغ دہلی'' سے تعبیر کیا ہے۔

افسوس کہ غالب سخن مدا
یہ حادثہ دہلی میں نیا اور ہوا

تاریخ جو اس کی میں نے چاہی اے شور
ہاتف نے کہا چراغ دہلی کا بجھا
۱۲۸۵ھ

شور ہاتف نے سر حیرت اوٹھا کر یہ کہا
ہے ہوا پیمانہ اسد اللہ بادہ خوار کا

چار رنج پیش شور نے والئی بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کی شان میں ایک

طویل خمسہ بھی لکھا ہے جو ان کے دیوانِ شور مطبع چشمۂ علم بے خزاں میں شامل ہے۔

نام ہے آپ کا سب خلق میں مشہور الیا — کہ یہ شہرہ نہ کبھی نور جہاں کو تھا ملا
جانتا وصف نہیں اور میں کچھ اس کے سوا — رتبہ ہو آپ کا کیونکر نہ رئیسوں میں بڑا
شاہ لندن کی مدد گار ہو بیگم صاحب

ہند میں آپ کے ہے علم و عمل کا چرچہ — کون سا نکتہ ہے باریک جو دل پر نہ کھلا
ہے یہاں متفق اللفظ گروہِ شعراء — غور کی جائے تو قانونِ عدالت کے سوا
تم سخن فہم بھی بسیار ہو بیگم صاحب

ہند میں ہم نے رئیس اور بھی ہیں دیکھے سنے — حق یہ ہے فہم و فراست میں کہاں ہیں ایسے
اس لئے حق سے دعا چاہئے ہر ایک یہ کہے — روز افزوں رہے الفت ملکہ کو تم سے
کیونکہ سرکار کی غمخوار ہو بیگم صاحب

جارج پیش شور نے 1857ء کے حالات اور واقعات کو مسدس کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ مسدس ان کے دوسرے دیوان میں شامل ہے جس میں وہ اس قتل و غارتگری کو اسلام کی تعلیمات کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

اپنے آقاؤں کو مارا ہے گنہگاروں نے — کچھ کیا پاس نمک کا نہ نمک خواروں نے
کر دیا دین خراب آہ جفا کاروں نے — حکم مانا نہ خدا کا بھی ستمگاروں نے
زن و بچہ جو کیا قتل سیہ کاروں نے
ان کو فتویٰ یہ دیا کون سے دینداروں نے

مجتہد ان کا ہے شیطان یہ باطل ہے جہاد — نہ مدد چاہئے ہمراہ سپاہِ بے داد
عرض دنیا کے لئے کرتے ہیں ناحق دلشاد — دعویٰ دین ہے اور دین کیا ہے برباد
زن و بچہ جو کیا قتل سیہ کاروں نے
ان کو فتویٰ یہ دیا کون سے دینداروں نے

رحم افسوس نہ آیا انہیں معصوموں پر — ایسے بے رحموں کی خوں سے نہ کیا خوف و خطر
ان پہ کیا ترس خدا کھائے کہ پتھر ہے جگر — یہ سیہ دل ہیں وہی جنکا جہنم میں ہے گھر

زن و بچہ جو کیا قتل سیہ کاروں نے
ان کو فتویٰ یہ دیا کون سے دینداروں نے

کون سی شرع ہے یہ کون سا مذہب ہے نیا — زن و بچہ کا نہیں ہے کہیں بھی خون روا
نہ تو ہے کوئی حدیث اور نہ ہے حکمِ خدا — فقہ والوں نے لکھا اور نہ اماموں نے کہا

زن و بچہ جو کیا قتل سیہ کاروں نے
ان کو فتویٰ یہ دیا کون سے دینداروں نے

ان تلنگوں نے کیا گرم ستم کا بازار — یہ وہ کالے ہیں کہ دل گوروں کا جن سے بے زار
سب یہ شیطان مجسم ہیں نہیں ہیں دیندار — شور تاریخ لکھو ان سپاہ غدار

۱۲۷۳ھ

زن و بچہ جو کیا قتل سیہ کاروں نے
ان کو فتویٰ یہ دیا کون سے دینداروں نے

جارج پیش شور نے 1857ء کے حالات پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ وہ خود بھی ان حالات سے متاثر ہوئے تھے اور اپنی جان بچانے کے لئے انہیں طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑے تھے جن کا تفصیل سے ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''وقائع حیرت افزا'' میں کیا ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ شور کی اس مثنوی کو خم خانۂ جاوید کے مؤلف لالہ سری رام نے شائع کیا ہے۔[3] جارج غدر 1857ء میں لکھتے ہیں:

بیاں ایسے فتنے کا کیونکر کروں — جگر تھاموں یا چشم کو تر کروں
یہاں تک کہ انگریز مارے گئے — حکومت کے جھنڈے اتارے گئے
سنی یہ خبر ہوش پراں ہوئے — قیامت کے آثار و ساماں ہوئے
پھری فوج اور پھر رعیت پھری — شہ وقت کی دم میں قسمت پھری
کیا قلعہ اور شاہ کو پھر خراب — ہوا نام [illegible] کا سب [illegible]
ہوا حال دہلی نہایت تباہ — لڑائی رہی رات دن پانچ ماہ
گھسے گورے کشمیری دروازے سے — [illegible] اس اندازے سے

ہوا حکم پھر فوج کو لوٹ کا ۔۔۔ تو خوب اس نے دہلی کو غارت کیا
کرو شکر حاکم کہ دل شاد ہے ۔۔۔ نئے سر سے دہلی پھر آباد ہے

جارج پیش شور کے ان چھ دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیر و سیاحت کے بھی بہت شوقین تھے اور انہوں نے ہندوستان کے جن جن شہروں کی سیاحت کی ان کو اپنی شاعری میں قلم بند کر دیا۔ جے پور کی چوڑی چوڑی سڑکوں، چوسر کے بازاروں اور ہوا محل کے محرابوں کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

گئے سیر کو ہم جو جے پور کی ۔۔۔ اسے دیکھ کر دل کو فرحت ہوئی
وہ جلوہ ہے پیدا پرستان کا ۔۔۔ کہ دل شاد ہو جن و انسان کا
وہ بت خانۂ چیں بنا ہر مکاں ۔۔۔ جو دیکھے وہ بن جائے بت بیگماں
جو بازار ہے وہی چوسر کا ہے ۔۔۔ وہاں لطف یہ اک نیا دیکھا ہے
جو دیکھے وہ دل ہار دے برملا ۔۔۔ ہر انساں کے چھکے چھٹیں ایسی جا
وہ مینار بازار میں ہے بنا ۔۔۔ کہ گردوں کو ہے رشک اس پر سدا
ہوا محل ہے ایسا محراب دار ۔۔۔ نیا ہر محل ہے وہ سب حلقہ دار
اور اس کی ہے ایسی فضا اور ہوا ۔۔۔ دلِ مردہ ہو دیکھ کر تازہ سدا
وہ دروازے ہیں شہر کے ہر طرف ۔۔۔ کہ جنت کے دروازوں پر ہے شرف
بلند اور چوڑے ہیں وہ دلکشا ۔۔۔ کہ تنگی نہیں نام کو بھی ذرا

گوالیار

ہے اک راج یہ بھی عجب پُر بہار

کسی وقت میں ہند قبضہ میں تھا ۔۔۔ یہی راج مالک تھا اس ملک کا
دے پلٹا جب چرخِ نیلی نے رنگ ۔۔۔ نظر آیا پھر وقت کا اور ڈھنگ
رعایا بھی سب اس کی خوش حال ہے ۔۔۔ بڑا بندوبست اور اقبال ہے
بنائی ہے کوٹھی وہ جنت نشاں

(پھول باغ)

ہے مشہور نام اس کا جو پھول باغ — تو بے دیکھے اس کے معطر دماغ
مکاں اس میں وہ وہ ہیں رشکِ اِرم — بہشتی بہشتوں میں پائیں گے کم
وہ کوٹھی میں ہے جلوۂ رشکِ طور — مہ و خور بھی ہو منفعل بالضرور
چھتوں میں طلائی وہ نقش و نگار — کہ مانی و بہزاد اُن پر نثار

(موتی محل)

بنا اور موتی کا ہے اک مکاں — فرشتوں کی صناعی اُس میں عیاں
رکھا یوں ہے موتی محل اسکا نام — وہ موتی کہ دُر دُر کہے صبح و شام
صفائی جو اُسکی سی موتی نہ پائے — جگر رشک سے کیوں نہ اپنا چھدائے
سراپا چمکتا ہے وہ اس قدر — چھپاتے ہیں مُنھ اپنا شمس و قمر
نظر کس کی لاؤں جو ڈالوں نظر — نظر میلی ہے وہ صفا سربسر

(بازار)

کروں حال بازار کا بھی رقم — کہ جولانیوں پر ہے میرا قلم
ہیں بازار خوشرو بنے سنگ کے — ہر اک رنگ کے اور ہر اک ڈھنگ کے
دوکانیں دو رویہ ہیں سنگیں تمام — ہر اک جنس کا کرلو سودا مدام

اردو کے ممتاز محقق اور ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ جارج پیش شور غالب کے ہم عصروں میں ایک مشہور مسیحی شاعر تھے۔ میرٹھ کے پاس ایک بستی میں قیام تھا اور میرٹھ اکثر آتے جاتے تھے۔ نہایت ملنسار اور وضع دار انسان تھے اور ان کے ملنے جلنے والوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی، بنگالی، مدراسی وغیرہ وہ مذہب و ملت اور ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔ بظاہر ان کا کوئی تعلق ہندوستان کے تیوہاروں سے نہیں لیکن ان کے دواوین میں ہولی، بسنت، محرم، عید وغیرہ وہ اہم تہوار کے بارے میں نظمیں، قطعے یا رتے ملتے ہیں۔ وہ اس قسم کی چیزیں مختلف تہواروں پر اپنے دوستوں کو بطور مبارکباد لکھ کر بھیجتے

تھے۔ایسے چند رقعے دیوالی کے بارے میں بھی ہیں۔ان میں سے ایک میں جو کسی بنگالی دوست بابو مکر جی کے لئے لکھا ہے، درگاماں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سری جگت اینکا کی استتی کیا کر سکے کوئی
کہے ہے لکشمی کوئی، کوئی کہتا ہے درگا جی
جو پہنچو فی الحقیقت ہے پرم ایشر کی یہ شکتی
نمستئی نمستئی نمستئی نمستئی

یعنی درگا جی اور لکشمی جی پرمیشور (قادر المطلق) کی شکتی (بنیادی قوت) کے دو مختلف نام ہیں۔میں ان کے آگے بار بار جھکتا ہوں۔[4]

اردو کے مسیحی شاعر جان پیش شور کے دواوین میں ہولی سے متعلق متعدد رقعے موجود ہیں۔ دیوالی کے رقعوں کی طرح وہ انہیں بطور مبارکباد ہولی کے دن اپنے ہندو دوستوں کو بھیجتے ہوں گے۔اس قسم کے منظوم رقعے اردو میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لکھے۔ایک رقعے کے دو شعر پیش ہیں:

خوشی سے پھول کے بلبل بھی ہولی گاتی ہے
اٹھی ہے چار طرف سے پکار بدلی ہے
گلال عبیر کے بادل ہیں سر بسر چھائے
کھلا ہے چرخ پر باغ و بہار ہولی ہے

جارج نے بسنت کی بہار کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ بسنت ہندوستان کی سب سے سہانی رِتو ہے اور ہمارے ملک میں بہار کی علامت سرخ یا سبز رنگ نہیں بلکہ پھولتی ہوئی سرسوں کا پیلا رنگ ہے۔

آمد ہوئی ہے ہولی کی آئی مگر بسنت
پھولی چمن میں پھرتی ہے شام و سحر بسنت
جس سمت آنکھ پڑتی ہے جنگل ہیں زرد سب
کیا کیا بہار پر ہے گل تر بتر بسنت

سر پر کسی کے پگڑی کسی کے دوپٹہ زرد
دکھلاتی اپنے رنگ کو ہے گھر بہ گھر بسنت[5]

جارج پیش شور نے جہاں ہندوستان کے تہواروں اور موسموں پر بے شمار نظمیں، قطعے اور رقعات لکھے ہیں وہیں ہندوستان کی خشک سالی پر کسانوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے ان کی حالت زار پر آنسو بھی بہائے ہیں۔ 1877ء میں جب دہلی میں ملکہ وکٹوریہ کا دربار منعقد ہو رہا تھا، ہندوستان ایک ہولناک قحط کی زد میں تھا اور انگریزی حکومت کی ''رعایا پروری اور حق پسندی'' کی پول کھل رہی تھی۔ جارج پیش شور کے یہ اشعار اسی دور کی یاد دلاتے ہیں:

گلشن جہاں میں کیا خزاں نے گل کھلایا ہے
کہ ہر برگ شجر کو زعفرانی کر دکھایا ہے
کسانوں کی یہ حالت ہے کہ دن بھر دھوپ میں جلنا
اور اس پر نہر کی خشکی نے دل ان کا سکھایا ہے
کوئی کوئیں چلاتا ہے کوئی بوک لگاتا ہے
کہ خشکی نے انہیں پانی سے پتلا تر بنایا ہے
خدا کچھ رحم فرمائے تو اس کال سے جاں بر
وگرنہ کال اب دنیا کا بے ڈھب سر پہ آیا ہے[6]

مسیحی شاعر جارج پیش شور نے ''حمد'' لکھ کر اسلام مذہب سے بھی اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی یہ حمد بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے:

کعبہ میں تو صدف اور صفا کو پایا
بت خانہ میں ناز اور ادا کو پایا
حاصل نہ ہوا کہیں سے دل کا مقصد
جب خود ہی ڈھونڈا تو خدا کو پایا

یاد خدا نہ ہو تو مزہ کیا حیات کا
بہتر ہے اس سے ذائقہ چکھنا ممات کا
گر بال بال اپنا بنے خامۂ بیاں
دفتر رقم نہ ہو سکے اس کی صفات کا
جن و بشر تو کیا کہ ملائک ہیں گم شدہ
پایا کسی نے بھید نہ اس پاک ذات کا[7]

انتخاب کلام شورؔ میرٹھی

دیوان اول

اس طلسماتِ جہاں میں موت کس کو یاد ہے
صاحبِ خانہ رکھتا ہے نام ہر مہمان کا

لبِ رنگیں پہ اس کے جب سے دیکھی پان کی سرخی
لہو تک خشک غیرت سے ہوا لعلِ بدخشاں کا

آباد ہے جہانِ بتاں سے دلِ خراب
افسوس تھا جو کعبہ وہ بت خانہ ہوگیا

کیونکر باندھوں میں کہاں پاؤں کہاں سے لاؤں
جب کہ مضموں کمرِ یار کا عنقا ٹھہرا
کیا زمانہ ہے کہ عاشق ہیں زر و مال کے سب
دوست ٹھہرا وہی جس پاس کہ پیسہ ٹھہرا

جا بھی سکتے تھے نہ کوچے میں ترے بے حکم ہم
پر تصور کی بدولت اب تو رستہ کھل گیا

ناکار جنس ہوں میں وہ بازارِ عشق میں
جس کی طرف کو منھ نہ خریدار نے کیا

یہ اثر دیکھا جذبۂ دل کا
اُٹھ گیا آپ پردہ محمل کا

آرزوئے خاکِ پا نے مجھ کو حیف	اس قدر پیسا کہ سُرمہ کردیا
ہاتھ آیا جب نہ مضمونِ کمر	شاعروں نے اس کو عنقا کردیا
دیں لیا ایماں لیا اور جاں بھی لی	فیصلہ دلبر نے میرا کردیا

اتنا ہی تھا کہ پردے میں شب کے عیاں نہ تھا
ورنہ یہ سایہ ساتھ تمہارے کہاں نہ تھا
دشتِ بلا میں سایہ کو بھی کس سے مانگتا
جز آفتاب سر پہ کوئی مہرباں نہ تھا

آئینہ کو کیا ہی دعویٰ اُس رُخِ انور سے تھا
روبرو جب اس کے آیا صاف اندھا ہوگیا
چشم نے دیکھا تھا تم کو اس لئے حیراں ہوئی
دل نے کیا دیکھا جو بیخود اور شیدا ہوگیا

پھر وہی شورِ جنوں ہے پھر وہی وحشت کا زور
فصلِ گل آتے ہی میں کتنا توانا ہوگیا

بھرا بیٹھا ہوں ہرگز چھیڑنا مجھکو نہ ہم چشمو
اگر رویا تو پھر عالم میں اک طوفاں اٹھادوں گا

دنیا میں کوئی مجھ سا بھی ناکام نہ ہوگا
گر ہوگا تو حسرت کے سوا کام نہ ہوگا

پردے میں رازِ عشق جو رہتا تھا خوب تھا
بیتابیوں سے دل کی وہ پنہاں نہیں رہا

ایک دم بھی دلِ وحشی کا نہ ارماں نکلا
گھر ہی یاد آگیا جب تنگ بیاباں دیکھا
ایک دن جان ہی جائے گی اس اندھیر میں ہائے
تجھ سے کہتے نہ تھے ہم اے شبِ ہجراں دیکھا

آبنی جان پہ سو بار جفا سے لیکن
حرف شکوہ کا نہ اک بار زباں پر آیا
کچھ زمیں ہی مرے گریہ سے نہیں ہے غرقاب
آسماں کو بھی مرے نالوں سے چکر آیا

ہوگئی جس کسی کو اُس کی خبر اُس کو عالم سے بے خبر دیکھا
کھل گئی آنکھ جب حقیقت کی وہی آیا نظر جدھر دیکھا

سرخئ پان کو تری دیکھ کے دل خون ہوا
دانت اس واسطے ہے بوسۂ لب پر اپنا
خدا ہی ان دنوں حافظ ہے ماہِ چرخ کا اے دل
کیا ہے عزم نالوں نے مرے اب چاند ماری کا
بنے ہیں حضرتِ دل مالکِ دینار داغوں سے
ملا تھا صرف ان کو پیشتر منصب ہزاری کا

دیکھا جو اس نے نیم نگہ سے کھلے نصیب
صد شکر بختِ خفتہ بھی بیدار ہوگیا

دھوکہ شیشے کا مجھے پہلے تو غنچے نے دیا
چشم پھر گل پہ جو ڈالی تو میں ساغر سمجھا

جاگے نصیب یار کے مجھ سے ملا دیا
ممنوں نہ کس طرح ہوں بھلا اپنے خواب کا

ہم اپنی طرزِ وفا سے کبھی نہ باز آئے
تم نے اُس کے کرم گو کہ بار بار کیا

خط پڑھا میرا غیر نے تب سے
تھا یہ تقدیر کا لکھا صاحب
عقل و تدبیر سے سب رازِ حقیقت کے کھلے
نہ کھلی پر نہ کھلی عاشقِ دلگیر کی بات

گو اس کی تیغ سے ہوا گھائل ہزار بار
ہوتا نہیں مگر مرا قاتل سے دل اُچاٹ

اظہارِ بندگی بھی تو اُس سے ہوا عبث
میں نے کہا کہ بندہ ہوں تیرا کہا عبث

زہے نصیب کہ برقع اُٹھایا جب اُس نے
تو میں نے دل ہی دیا پہلے منہ دکھائی آج

ساقیا شیشے میں دل کے وہ پری آئی نظر
اک برانڈی کا دیا تو نے جو یہ پیمانہ آج
اک طرف ہے شورِ طفلاں اک طرف پتھر کی مار
دیکھ لے کس دھوم سے نکلا ترا دیوانہ آج
شور دامانِ توکّل کو پکڑ لے مضبوط
منّتیں شاہ و گدا کی کبھی زنہار نہ کھینچ

دل لگانے کا کچھ مزا پایا
ہم نہ کہتے تھے ایسا کام نہ کر
قفسِ تن کو چھوڑ کر طائرِ روح
ایسے غم خانہ میں مقام نہ کر

دلِ بیمار کی کیونکر نہ خبر ہو پیہم
تار برقی یہ مرے اشک کا ہے تار ہنوز
اب دوا اور دعا کا بھی نہیں کام رہا
دردِ فرقت سے یہاں تک تو ہوں بیمار کہ بس

حاجت بری بلا ہے پھراتی ہے دربدر
ورنہ بھلا کسی سے کسی کو تھی کیا غرض

جو جو کہ انتخاب جہاں میں تھے ہائے ہائے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نہیں ہے نشاں تلک
عمرِ رواں کا کچھ نہ ملا آج تک نشاں
گو ہم تلاش کرتے گئے لامکاں تلک

دلِ پُرداغ ہے وہ گلشنِ حسرت میرا
دیکھ جاتا ہے اسے سینہ فگار ایک نہ ایک
ہے نہاں عشق سے میرے دلِ مضطر میں آگ
ہوتی ہے جس طرح سے آہن میں اور پتھر میں آگ

سمایا ہے ایسا وہ نظروں میں میری
نہیں دوسرا اس میں آنے کے قابل

مفلس سے بات بھی نہیں کرتا ہے کوئی حیف
سر پر بٹھائے جاتے ہیں زردار آج کل

دولت دنیا سے مستغنی ہمیں اس نے کیا
جانتے ہیں خاک پائے یار کو اکسیر ہم

نہ آئی تھی موسیٰ کو بھی تاب جس کی
ہم اس نور کو دمبدم دیکھتے ہیں

چشمِ حق بیں سے جو دیکھا ہم نے یہ روشن ہوا
دل خدا کا آئینہ وہ جلوہ گر آئینہ میں

اگرچہ خاک ہیں ہم بھی بشکلِ سرمۂ چشم
نظر میں لوگوں کی پر اعتبار رکھتے ہیں

اب کفن کو تار بھی باقی گریباں میں نہیں
کیا دکھائی ہے جنوں نے دستکاری اندنوں

گر خدا دیوے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے وہ
پر لکھا ہے یہ کہ دولت بے ہنر ملتی نہیں

جینے کا فکر جان گھٹاتا ہے رات دن
مرنے کا سچ جو پوچھیے تو کچھ بھی غم نہیں

اوپر اوپر نہیں جائیں گی یہ نیچی نظریں
ہم نہ ہوں گے جو رہی شرم و حیا آنکھوں میں

امیدِ عفو تجھ سے نہ ہوتی خدا اگر
ہم اتنے محو کاہے کو ہوتے گناہ میں

میں نے ہزار بار کہا غم گسار ہوں
نِکلا نہ اُن کے منھ سے مگر ایکبار ہوں

کبھی جو باغ میں اس رشکِ گُل کا ذکر چلتا ہے
تو کیا کیا جھانکتے ہیں گُل خجل ہو کر گریباں کو

آپ کا شور جہاں میں نہ ہو کیونکر اے شورؔ
کہ فرنگی بھی ہو شاعر بھی ہو مشہور بھی ہو

یہ ہے اعجاز زلفِ عنبریں کا
کیا اک لٹکے میں کافر جہاں کو
گر اپنا بھلا چاہے تو کر سب کا بھلا تو
عالم میں کوئی شے نہیں احساں سے زیادہ

دے چکے ابتدائے عشق میں دل
اب گئی جان انتہا یہ ہے

مٹایا جان و دل جس نے کہ دیکھا
یہ خوبی ہے تمہارے نقش پا کی

عدم سے اس لئے گُل زر بکف آیا کہ دنیا میں
نہیں ممکن کہ کوئی کام بے دام و درم نکلے

اے چرخ کیا جہان کا غم ہے مرے لئے
ہاں اتنا بوجھ دے کہ جو مجھ سے اٹھ سکے

گور کی منزل بنانی چاہئے
فائدہ کیا قصر کی تعمیر سے

جو سبکسار تھے دنیا میں گئے سب آگے
رہ گئے پیچھے ہمیں اپنی گرانباری سے

وہ مرا ظرف ہے بہکوں گا نہ ہرگز میں کبھی
ایک خُم بھی جو برانڈی کا پلادے ساقی

کوچۂ بُت میں روز دیکھتا ہوں
جمع ساری خدائی ہوتی ہے

جامۂ تن میں ایک تار نہیں
مفلسی کو ملاحظہ کیجے

غمخوار میرا غم ہے میں ہوں غم کا غم گسار
مجھ غمزدہ کو دیکھئے اور غم کو دیکھئے

ہم نے دنیا کو جب خیال کیا
صاف تشبیہہ خواب کی سی ہے

ترک دنیا میں ہے ثواب بڑا
یہ تو بستی عذاب کی سی ہے

جاں گئی پر نہ گیا دل کا غبار
مٹی اعدا سے دلاتے ہیں مجھے

گردشِ افلاک نے پامال ہم کو کر دیا
دیکھئے کیونکر سنواریگا خدا بگڑی ہوئی

اس چشم کی خونباری سے اب دیکھئے کیا ہو
ہر وقت مجھے ہائے رے اس ٹپکے کا ڈر ہے

عمرِ رواں کو ڈھونڈھا نہ پایا کہیں پتہ
کیا جانئے ہوا کی طرح وہ کدھر گئی

اللہ ری بے خودی کہ خودی سے نکل گیا
ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنی گواہ تھی

جام بھی برانڈی کا کیا دوربیں ہے واہ
پیتے ہی جس کو سوجھتی ہے دور دور کی

دیدار تیرا روز قیامت ہوا تو کیا
فرصت کسے ملے گی حساب و کتاب سے

انتخاب دیوان دوم

عجب کیا ہے نشاں ایسا رہے دیوان سے اپنا
کہ جیسے آئینہ سے نام روشن ہے سکندر کا
وہم و خیال کی ہے واں تک رسائی مشکل
کچھ عرش سے بھی آگے اس کا مقام نکلا

یہ باتیں کہنے کی سب ہیں زاہد جو دیکھ پائے تو اُس صنم کو
تو پھر تیمّم کی اصل کیا ہے ترا وضو بھی نہیں رہے گا

جاتی نہیں ہے اُس کی کسک عمر بھر کبھی
ہر دم کھٹکتی رہتی ہے دل میں نظر کی چوٹ
انساں تو چیز کیا دلِ فولاد نرم ہو
دنیا میں سب سے شور زیادہ ہے زر کی چوٹ

گٹکری بنکر ہوا میں کھائے گی چکّر سدا
گنبدِ گردوں میں گر لپٹی مرے نالے کی گونج

نہیں ہے موج کو اک دم بھی جو قرار کہیں
بھٹکتی پھرتی ہے دریا میں کیا حباب کی روح

ہے وہ مثل کہ مان کا ہے پان بھی بہت
تحفہ کا ایک خوشہ بھی ہے لاکھ من کی شاخ

رنگیں یہ غزل جائے جو شمس الامرا تک
ہوجائے سخن مثلِ شفق تا بہ دکن سُرخ

شورؔ صاحب اُس سے اب کیونکر بنے گی آپ کی
تم ہو عاشق حُسنِ سادہ پر وہ ہے زیور پسند

سارے جہاں میں ہے اسی کی جو روشنی
اس واسطے خدا نے کیا روئے زر سفید

کسی نے اوڑھے دوشالے کسی نے ہیں کمبل
نہ چھوڑا تو نے نہ چھوڑا کسی کا پیچھا ٹھنڈ

نہیں ہے دشت نوردی سے ایک دم فرصت
بنایا کس نے مرے پاؤں کا رکاب میں گھر

ہوس تھی زیست میں مرنے کی بہرِ امتحاں ہم کو
نہ دیکھا مر کے زیرِ خاک بھی آرام سو سو کوس

گلگیر نے دہان میں لی جب زبانِ شمع
پروانے جل کے ڈھیر ہوئے سب لگن کے پاس
تیرے آنے سے چمن کی اس قدر اکھڑی ہو
پتیاں بکھری ہوا میں دم میں گل تر پاش پاش

کب تک برنگ غنچہ رہے چاک چاک دل
اے موسم بہار دکھا ایک بار عیش
سنبل کو باغ میں بھی پریشانیاں ہیں روز
پاتا بھی ہے جہاں میں کوئی سوگوار عیش

حیات پائے گی ہرگز نہ ایک شب کے سوا
کرے ہے خندہ عبث آتشیں شرار پہ شمع

ہے کریموں سے ہمیشہ وقف محتاجوں سے فیض
کیوں نہ ہو نیساں کی بخشش سے صدف دُر بکف

گُلال ایسا اُڑایا ہے اُس نے ہولی میں
کہ تا بدامنِ گردوں بنا غبار شفق

خلد کو جب کہ زمیں سے کیا آدم نے عروج
بولے قدسی کہ کہاں پہونچی ہے تقدیر سے خاک

صوفی کو وجد و حال میں لانا ہے کیا کمال
سبزہ کو جب کہ صحنِ چمن میں لٹائے راگ

روئے زمیں سے جو کہ سُوئے آسماں گئے
آئی نظر نہ ایک کے نام و نشاں کی شکل

اپنے جامہ میں نہیں پھُولا سماتا اُس گھڑی
جب نظر آتے ہیں ٹوپی پر مجھے اُس مس کے پھُول

ہم کو بھی دل کے قید میں رکھنے کا ہے خیال
تارِ نفس سے اپنا بناتے ہیں دام ہم

ہم تو دونوں کی دلاخیر مناتے ہیں مُدام
نہ تو کچھ کفر پہ رکھتے ہیں نہ اسلام پہ نام
اک دن نہ چین تو نے زمیں پر دیا فلک
کس جا کہ پھینک دیں تجھے سر پر اُٹھا کے ہم

گھر بیٹھے جب خدا نے دیا ہم کو صبر و شکر
ہرگز نہ پاس جائیں گے شاہ و گدا کے ہم

مژہ پر اشک اپنے بے سبب آ کر نہیں تھمتے
گراں قیمت جو گوہر ہیں وہ تلتے ہیں ترازو میں
رواں ہوتی نہیں مے انتظار اُس بُت کا ہے شاید
صُراحی ہچکیاں لیتی ہے اور شیشہ ہے اُچھو میں

جو خدائی میں بُتوں کی لائے شک تو یا خدا
ٹوٹ پڑیو سر بسر اُس بدیقیں پر آسماں

دیا ہے رتبہ خدا نے بہ سر جبینوں کو
کہ دیتے چاند سے نسبت ہیں سب حسینوں کو

اُس نے کوچہ سے پسِ عمر اُٹھایا ہم کو
مل گیا دیس میں پردیس نکالا ہم کو

جس جگہ بیٹھے وہی دیکھ کے جلوہ اُٹھے
فخر کعبے کو نہ تذلیل ہے بُت خانے کو

حرم میں دیر میں گرجے میں ہے ایک
یہ بھید اہلِ دوئی پر کب عیاں ہو

دکھائی کس نے وہ چشم میگوں کہ ہوش جاتا رہا ہے میرا
پڑا ہوں غش میں خبر نہیں کچھ شراب چھڑکو شراب چھڑکو

رہائی قید علائق سے زندگی میں نہیں
اُلجھ رہا ہے آفات کے طناب میں پاؤں

جانے ہے کون درد مرا اُس کے عشق میں
کچھ دم شماری کے ہیں قضا و قدر گواہ

اللہ رے شوقِ دید کہ سائے کی طرح سے
ہم ساتھ ساتھ اُن کے رہے وہ جہاں چلے
جس میں رہے نہ طاقتِ رفتار ضعف سے
مثلِ غبار کیوں نہ پسِ کارواں چلے

ہوئی خلق عاجز وفا کرتے کرتے
نہ تنگ آئے یہ بُت جفا کرتے کرتے
بحرِ ہستی ہے جب رواں دن رات
ایسی بستی میں کیا قیام رہے
جب زباں پر ہو بُت کے مرگ اور زیست
پھر خدائی میں کیا کلام رہے

ہماری کیا ہے حقیقت جو بُت پہ مرتے ہیں
خدا بھی دیکھے جو اُس کو تو خود فدا ہو جائے

نہ پائی کوچۂ مقصود کی راہ ایک دن ہم نے
سرِ جادہ رہے جوں نقشِ پا محروم منزل سے

شاطرِ ایام کے منصوبے رہ جائیں گے سب
جب بڑھے گا مہرہ اپنا مات ہی رہ جائے گی

چاہیئے تقسیم کرنا وقت کا ہر کام میں
ورنہ دل میں حسرتِ اوقات ہی رہ جائے گی

شورؔ صاحب کیا بھروسا زندگی کا سچ یہ ہے
سب فنا ہو جائیں گے وہ ذات ہی رہ جائے گی
تدبیر کرلو آج ہی کل ہو سکے گا کیا
ہے وہ مَثل کہ مار کے پیچھے سنوار ہے

جب آئے تھے تو کیالائے تھے ہم ہستیِ فانی میں
اور اب جانے کو ہیں تیار پھر سوئے عدم خالی

جُز داغ مِلا کچھ بھی نہ الفت کے شجر سے
اس باغ میں ہم لینے کو یہ ہی ثمر آئے
کچھ تو ہے بنی جان پہ اس دل کی بدولت
آنکھوں سے نکل آج جو لختِ جگر آئے

نہ آئی اگر بن کے معشوق تو
ترے ساتھ کب ہم اجل جائیں گے
زمیں سے نہ اُٹھیں گے طفلِ سرشک
اُٹھایا تو فوراً مچل جائیں گے
جو ٹھانی ہے دل میں کریں گے وہی
گئے وہ نہ گر آج کل جائیں گے

یہ فرق جیتے ہی جی تک گدا و شاہ میں ہے
وگرنہ بعدِ فنا مشت خاک راہ میں ہے
نشاں مقام کا گم اور نہ رہنما کوئی
غرض کہ سخت اذیت عدم کی راہ میں ہے
گدا نے چھوڑ کے دنیا کو نقدِ دیں پایا
بھلا یہ لطف کہاں شہ کے عزو و جاہ میں ہے
پسند طبع نہیں اپنی چار دن کا ملاپ
مزا تو زیست کا اے میری جاں نباہ میں ہے

میں مریضِ عشق ہوں مجھ کو شفا ہوتی نہیں
کیوں عبث لے جاتے ہو ہمدم شفا خانے مجھے

جس کو چاہا اے بتو تم نے کیا اپنا غلام
غور سے دیکھا تو ہے ساری خدائی آپ کی
لیلیٰ شب پہنتی ہے کہکشاں کے ہار کو
دیکھ لی ہے جب سے زنجیرِ طلائی آپ کی

گر خوشی آج ہے تو پھر غمِ فردا کیا ہے
جس پہ ہو فضل خدا کا اُسے کھٹکا کیا ہے
دل میں جب کیف دو عالم کا بھرا ہے اپنے
جستجوئے حرم و دیر و کلیسا کیا ہے

غنچہ کہنے سے تنگ ہوتے ہیں
گل کہا تو گلے کا ہار ہوئے

ہمارا ہوتا تو رہتا ہمارے سینے میں
یہ دل بنا تھا تری چشمِ فتنہ زا کے لئے
کہا جو میں نے وفا کر تو ہنس کے فرمایا
جفا کو چھوڑ دیں ہم آپ کی وفا کے لئے

ہم ہوشیار ہو کے ہوئے دربدر خراب
غافل ہے جو جہاں سے وہی ہوشیار ہے
واعظ ڈرانے کو کوئی فقرہ سُنا اب اور
محشر تو ایک فتنۂ رفتارِ یار ہے

کیوں کر بسر اوقات کریں اپنی جہاں میں
جینے کی ہے امید نہ مرنے کی خبر ہے

زباں سے تری جب نہیں ہو چکی
تو جینے کی صورت وہیں ہو چکی
تمام اپنی جان حزیں ہو چکی
کرو اب بھی ہاں کچھ نہیں ہو چکی

اپنے گناہ پر ہمیں کیا کیا ملال تھے
پرسن کے خوش ہوئے کہ وہ نکتہ نواز ہے

تاب نظارہ نہ ہو نقشۂ مانی بگڑے
کھنچے کس شکل سے پھر آپ کی تصویر بنے

مجھ کو بلا میں ڈالا بچی آپ بال بال
یہ چال سربسر تری زلفِ دوتا کی ہے

کیونکر نہ ہوں عزیز یہ داغِ جگر مجھے
سونپی ہوئی نشانی مرے دلربا کی ہے
پیتا ہوں صاف کرکے مئے پرتگال کو
الفت جو میرے دل میں کسی پارسا کی ہے

اشکباری کے سبب محروم ہوں دیدار سے
بند آنکھیں ہوگئی ہیں آنسوؤں کے تار سے
ہوں کرسچن پر مجھے ہندو بچہ سے عشق ہے
چاک دامن میرا سی دو رشتۂ زنّار سے

شفا مرض سے نہ بخشے گا کس طرح سے مجھے
کہ وہ خدا بھی ہے شافی بھی ہے طبیب بھی ہے
گدا کو شاہ جو اک دم میں کر دکھاتا ہے
عجب طلسم یہ انسان کا نصیب بھی ہے
وہ چھوٹے کس طرح پایا ہو جس کو جاں کھوکر
اگرچہ میرا عدو ہے ولے حبیب بھی ہے

تڑپا کئے ہم بے خبری میں شبِ فُرقت
جب یاد ترے رُخ کو کیا ہم نے سحر تھی

شیشۂ دل ہوا وبالِ حیات
آگیا بال اس میں ہل ہل کے

جو پوچھا میں نے کیوں مجھ کو دیے ہیں رشک کے صدمے
تو بولے ہنس کے اس ترکیب سے الفت بڑھائی ہے

شوق نے کی جو رہبری دل کی | منزلِ عشق طے ہوئی دل کی
جان پر اپنی ہائے کیوں بنتی | بات جو مانتے کبھی دل کی
دور ہم سے ہیں وہ تو کیا ڈر ہے | پاس ہے اپنے آرسی دل کی
اک نظر نے کیا ہے کام تمام | آرزو بھی تو تھی یہی دل کی
جب جوانی گئی چھڑا کر ہاتھ | اُس پہ پیری نہ کچھ چلی دل کی

بیتاب مجھے دیکھ کے بیتاب ہے بجلی
نالوں کی مرے طرز پپیہے نے اُڑالی
کوک کوئل کی کہیں شور پپیہے کا کہیں
مور بولے ہیں کہیں دیکھ گھٹا ساون کی
ریا کے سجدے کا دھبہ دُھلے وضو سے خاک
مٹا نہ داغ یہ زاہد کی شست و شو نہ گئی

کوئی اکسیر نہیں اس کے مقابل ہرگز
خاکساری سے میسر مجھے دولت ہوئی
دیکھو آئینہ نہ دیکھو میں کہے دیتا ہوں
آپ سا دیکھ کے اُس میں تمھیں حیرت ہوئی

روز محشر ترا دیدار ہوا بھی تو کیا
بھیڑ میں دیکھنے کی یاں کسے فرصت ہوئی

انتخاب دیوان سوم

دل صاف کر آلائشِ دنیا سے کہ یہ بھی
آئینہ سکندر کا ہے اور جام ہے جم کا

کُھلے گر دیدۂ عرفاں نظر آئیں نئے جلوے
تماشا دیکھے پھر انساں ہر اک جا اُس کی صنعت کا
قدم آیا ہے جس دن سے زمیں پر نا گہاں اپنا
دکھاتے آنکھ ہیں تارے عدو ہے آسماں اپنا

اُٹھ اُٹھ کے خاک گوشۂ دامن نہ چھو سکے
اتنا مرا غبار کبھی ناتواں نہ تھا

کر کے طے منزلِ دُنیا وہ تھکے ہیں رہرو
گور میں سُو کے نہ کروٹ بھی بدلتے دیکھا
تمام عمر عذاب و گناہ میں گذری
میں پھر خدا سے امیدِ ثواب کیا کرتا

سب جگہ اُس کا ہے جلوہ تو کہیں پوچھیں ہم
دیر کس کا ہے حرم کس کا ہے گرجا کس کا

بات کرتے نہیں پھر دعویٰ خدائی کا بھی ہے
ہے عجب ڈھنگ بتوں کی بھی خود آرائی کا

بوسہ ہائے لبِ شیریں کا صلہ کیا دیجے
نہ سمرقند ہے اپنا نہ بخارا اپنا

پوچھتے کیا ہو دل کی ویرانی
یہ ہمیشہ سے گھر خراب رہا
راہ کعبے کی نہ پائی شیخ نے
وہ حرم میں جا کے نا محرم رہا
اشک گر ہوتا تو بہہ جاتا نہ وہ
پارۂ دل تھا مژہ پر تھم رہا
عمر رفتہ نہ پائی ڈھونڈھے سے
دل سدا درپئے سُراغ رہا

نارسائی طالعِ ناکام کی کام آ گئی
کل طبیعت شوخ کی جس دم خفا تھی میں نہ تھا

ہماری آہ کو ان صدمہ ہائے دنیا نے
ہوا کے گھوڑے پہ ہر دم سوار ہی رکھا

باغباں نے بنا بنا کے چمن
کھیل کی طرح پھر بگاڑ دیا

تھے دلاور جہاں میں ہم بھی بہت
صدمۂ غم نے پر پچھاڑ دیا

حشر میں آپ نے صورت جو دکھائی ہم کو
شکوے سب بھول گئے جور نہ کچھ یاد آیا
عالمِ عیش و طرب میں نہ کیا اس کا خیال
جب دیا رنجِ بتوں نے تو خدا یاد آیا

زندہ ہو جاتا ہے جامِ بادہ سے ہر مُردہ دل
یہ عرق ہے ساقیٔ کوثر کا کھنچوایا ہوا
دل تو حاضر ہے ولے افسردہ و پژمردہ ہے
آپ کے کس کام کا یہ پھول مُرجھایا ہوا

خدا کو عجز سے رغبت ہے، اُس کے بندوں میں
نیاز جس نے کیا وہ نیاز مند ہوا

کچھ تو ہو خوفِ خدا کچھ تو ہو دنیا کا لحاظ
فرض انسان کو ہے صاحبِ ایماں ہونا
روز ہے عشق صد آزار سے لب پر توبہ
فائدہ ہم جسے سمجھے تھے وہ نقصاں نکلا

فکر بے فائدہ بے سود تردُّد ہر دم
بس وہی ہوگا جو تیری رضا نے چاہا

گر یہ جلنا ہی نصیبوں میں مرے تھا لکھا
شمع بن کر ترے آگے سرِ محفل ہوتا

زاہدو جاؤ ہوا کھاؤ بڑا دن ہے آج
میکشو آؤ کہ وہ ساقیِ گلفام آیا

ہم جائیں کیا خیال کو بھی روکتا ہے اشک
غیروں کے اختیار میں بزمِ بتاں ہے اب

ہے خانۂ اجل میں تمنائے جاں وہی
گھر ہے رقیب کا وہ مسیحا جہاں ہے اب
مجھ کو خود شوقِ اسیری کھینچ کر لایا یہاں
کچھ نہ اندیشہ کریں اب میرے بال و پرسے آپ

رُخ پر نقاب اُن کے پڑا بے سبب نہیں
دیتے ہیں اس میں شربت دیدار چھان کر

جل کر گگڑی رہے گی جو اک پاسے رات بھر
باقی سحر تلک نہ رہے گا نشانِ شمع
بس داد کی امید تو اب اُن سے ہو چکی
رکھتے نہیں وہ کان بھی فریاد کی طرف
اردو کی جو زباں تھی ہوئی میر کو نصیب
شاعر جُھکے ہوئے ہیں اس استاد کی طرف

زندوں کا ترے عشق میں ہے چاک گریباں
مُردوں نے کیا غم میں ترے اپنا کفن چاک

کس کو دیکھیں آنکھ سے مثلِ حباب
آپ ہی دم میں مٹے جاتے ہیں ہم
جتنی چادر دیکھتے ہیں ہم نشیں
پانوں بھی اتنے ہی پھیلاتے ہیں ہم
غمکدہ ہے شور اس دنیا کا نام
اس میں کیا غم کے سوا پاتے ہیں ہم

ادھر ہے کعبہ اُدھر ہے مندر یہاں ہے تقویٰ وہاں ہے رندی
کبھی یہ کھینچے کبھی وہ کھینچے عجب طرح کے عذاب میں ہوں

گل تو کیا ہے یہی کہتے ہیں ہوا کے جھونکے
چٹکیوں میں ابھی غنچوں کو اُڑا سکتے ہیں
اس حُسن کی بہار پہ دل کو فدا کروں
غنچے کی طرح دیکھ کے ہر دم کھلا کروں

اک دم کی زندگی پہ ہوں کیا شاد ہم یہاں
مثلِ حباب ہاتھ میں ہر دم فنا کے ہیں

صدقے تمہارے حُسن کے قربان ناز کے
تم سا کوئی جہاں میں طرح دار ہی نہیں
ملنے سے اُس کے ایسی شفا ہوگئی مجھے
گویا کبھی ہوا تھا میں بیمار ہی نہیں
روئے فرشتے نامۂ اعمال دیکھ کر
مجھ سا تو ہوگا کوئی گنہگار ہی نہیں

ناخنِ تدبیر سے عُقدہ کھُلا اُس کا نہ جب
پنجۂ قدرت کے آگے رکھ دیا تقدیر کو

اک نظر دیکھ مجھے اس میں ترا نام بھی ہو
عین ہو لطف ترا اور مرا کام بھی ہو

مستِ شرابِ عشق نہیں آتا ہوش میں
غافل کبھی نہ جانیے اس ہوشیار کو

پہلے تو خاک ہوئے پھر اُڑے ہم باد کے ساتھ
تھیں لکھیں روزِ ازل سے یہی تقدیریں دو

ہزار شکر کہ مجھ پر خدا کو رحم آیا
وگرنہ عصیاں تھے میرے شمار ہونے کو

ہم کو کافی ہے فقط اُس کی عنایت کی نظر
آنکھ بدلے ہے زمانہ تو بدل جائے وہ

دوئی جاتی رہے گی انقلابِ دہر سے جس دم
تو اک ہو جائیں گے دیر و حرم آہستہ آہستہ
عجب کیا ہے اگر [illegible] وحدت [illegible]
کہ [illegible] ہوتے ہیں اب ہم [illegible] آہستہ آہستہ

یہ جا ہے شعر [illegible]
[illegible] نہ جانے کا پتہ اپنے [illegible] ساتھ

کیوں نہ فخر مجھ کو ہزاروں میں ہو نصیب
رکھتے ہیں جب کہ سر پہ مرے چار یار ہاتھ
تنگی سے ایسا وقت گزرتا ہے آج کل
آتا نہیں ہے اب تو کہیں سے اُدھار ہاتھ
حاجت نہ پائے بوس کسی کی پڑے گی پھر
رکھے گا سر پہ میرے جو پروردگار ہاتھ
نامِ خدا یہ اپنا توکل ہے رات دن
جوڑیں کسی کے آگے نہ ہم بار بار ہاتھ
دولت سے دو جہان کی کردیوے تو غنی
دینے کے اے کریم ترے ہیں ہزار ہاتھ

چلیں گے کیونکر اُٹھا کے سر پر ٹلے گا دل سے یہ بار کیونکر
کہ ہے گناہوں کا بوجھ بھاری الٰہی توبہ الٰہی توبہ
ہوئے تھے پی کر ہم ایسے غافل کہ خوفِ عقبیٰ رہا نہ اے دل
کیا تھا کیوں شغلِ بادہ خواری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

خدا سمجھے کہیں اس بیکسی اور ناتوانی کو
کہ ساتھ اب کارواں کا ہائے چھوٹا جائے ہے ہم سے

کھلا نہ روز نئے گُل تو آبلہ پائی
دکھا نہ روز شگوفے تو نوکِ خار مجھے
خدا نے اپنے جلوے کو دکھایا جسمِ نوری میں
ہوئے کون و مکاں روشن کھلی قسمت کہاں میری

آج خدمت میں تمہارے جانِ زار آنے کو تھی
لے گئی موت اُس کو یہ اُمیدوار آنے کو تھی
کیسے غنچے کیسے گُل کیسی صبا اے عندلیب
وہ چمن ہی مٹ گیا جس پر بہار آنے کو تھی

ہم نے بھی اس توقع پہ تو اپنی جان دی
وعدہ ہے روزِ حشر کا دیدار کے لئے

کیوں خاک میں ملنے کو عدم سے یہاں آتے
پہلے سے ہمیں ہائے کسی نے نہ خبر کی
جب سے دل جانبِ عقبیٰ یہ ہوا ہے راغب
پھر کسی چیز پہ دنیا کی نہ رغبت آئی
بادِ صبا کے ہاتھ سے ہوں اس قدر نہال
سرسبز ہو رہا ہوں نہالوں کے سامنے
ایسی ہوا زمانے کی بگڑی کہ آج کل
قدر شریف کم ہے رذالوں کے سامنے

جلوۂ ہوش ربا جب سے ترا دیکھا ہے
اپنے بیگانے کی واللہ خبر کس کو ہے
رونے پہ مرے ہنس کے نمک پاشی اس نے کی
تجھ کو مزے ہے یہ مفت کے لخت جگر کے

بادِ خزاں کے چلتے ہی غنچہ رہا نہ گل
گردش نے اس فلک کے یہ کیا گل کھلا دیا

دیکھ کر آج بتوں کا جلوہ
اک خدائی بخدا لوٹ گئی
پانی پانی ہوا جاتا ہے اسی فکر میں دل
اپنے اعمال کی اک دن جو سزا پانی ہے

مہر خاموشی لگی بزم میں آتے ہی ترے
تابِ تقریر کسی کو سرِ محفل نہ رہی

بہتر نہ اس سے تھی کوئی دلبستگی کی جا
تجویز دل ہوا ترے مسکن کے واسطے
کافی ہیں دل لگی کو ہمیں یہ بتانِ ہند
لندن کو جائیں گے نہ فرنگن کے واسطے

پُرسشِ جور نہ ہو حشر میں تیری مجھ سے
کہ خدا جانے وہاں منہ سے مرے کیا نکلے
زمیں میں سونپ کر آیا خبر لینے نہ پھر کوئی
صدا آتی ہے یہ اکثر مجھے گورِ غریباں سے

جو مقبول اپنی دعا ہوگئی — تو ہر دردِ دل کی دوا ہوگئی
توقع نہ تھی مجھ کو یہ روح سے — کہ وہ دم کے دم میں ہوا ہوگئی
لگایا جو منہ زاہدوں نے اسے — تو بنت العنب پارسا ہوگئی

غصّے میں اُن کا رنگ نکھرتا ہے اور بھی
ہم سے بگڑ بگڑ کے وہ کیا کیا سنور گئے

دُرِ اشک میرے یہ ہیں منتخب
کہ خاک آبروئے گہر ہوگئی
دکھایا زمانے نے کیا انقلاب
کہ معدوم قدرِ ہنر ہوگئی

جب تلک ہوش ہے انساں کو کرے یادِ خدا
پھر دمِ نزع یہ اوسان رہے یا نہ رہے
غرض نہ دیں سے مجھے کچھ نہ کام دنیا سے
فقط ہے تیری عنایت کی آرزو باقی

عجب دکھایا زمانے نے انقلاب ہمیں
کہ جو جو اپنے تھے وہ آج کل پرائے ہوئے

نیستی سے اوج ہے اس ہستیٔ موہوم کو
زندگی پیدا خدا نے کی قضا کے واسطے
چمن کا رنگ بگڑا دیکھ کر جیتا ہوں بلبل سے
نہ امید وفا رکھنا کبھی تو بھول کر گل سے
بتوں کی سرد مہری کا ہوا معلوم یہ باعث
کہ آب و گل ہے ان کی خطۂ کشمیر و کابل سے

بھید سے تیرے خداوندا نہیں واقف کوئی
بارہا عالم بنے بگڑے بنے بگڑے بنے
صانع قدرت یہی یہ شاہدی انصاف کی
دل مرا شیشہ ہے اس بات کا دل شاہد ہے

جبکہ لچکے پھول کی بدھی سے وہ نازک کمر
پھر کہو اُن کے لئے کس چیز کا زیور بنے

انتخاب دیوان چہارم

وائے نادانی ہوا یہ دم آخر ظاہر
ہائے تنہا ہی چلے کوئی نہیں تھا اپنا

جب گھر میں یار ہے تو پھراتا ہے کیوں مجھے
حیراں ہوں میں کہ اس دلِ ناداں کو کیا ہوا
نہ پوچھو وحشتِ دل کی حقیقت مختصر یہ ہے
کہ سناٹے میں گردش تھی تحیّر میں بیاباں تھا
اسی خیال میں دن رات میں تڑپتا ہوں
تمہیں قرار بھی دوگے جو بے قرار کیا

اے شیخ نہ مستِ مئے پندار دوئی ہو
کعبہ ہے اگر اُس کا تو بُت خانہ ہے کس کا
دل بادۂ توحید سے لبریز ہے اپنا
اے زاہدِ کج فہم یہ پیمانہ ہے کس کا

ہمارے اشکوں کی قیمت کو کب پہنچتا ہے
جگر چھدا کرے غم سے ہزار موتی کا

صد شکر کشاکش سے چمن کی کیا آزاد
ممنون نہ کیونکر ہوں میں بے بال و پری کا

عشرت کدۂ دہر سے محشر ہمیں بہتر
پردہ تو وہاں زیبِ رُخِ یار نہ ہوگا

حیرت میں بھی ہے آئینہ گر غور کیجئے
اُس کا نشاں ہے اس میں کہ جس کا نشاں نہ تھا

حضرتِ دل نہ کسی پر مریے
مرتے مرتے یوں ہی مرجایئے گا

اب تک مجھے معلوم نہیں اپنی حقیقت
ہوں کون کہاں آیا ہوں ہے قصد کہاں کا

دنیا میں بجز گور کے کیا خاک بناتے
کچھ نام کی خواہش تھی نہ ارماں تھا نشاں کا

حصار روس ہے گر کوہ فرسا
نہیں پر قلعۂ کابل سے اونچا

ہم نہ کہتے تھے کہ تم تاب نہ لاؤ گے کبھی
اب کہو طور کا جلوہ تھا یہ موت کیسا

قضا کہتی ہے روز بالیں پہ آکر
ٹلے گا نہ روزِ معیّن کسی کا

پیری نے آکے لطفِ جوانی مٹادیا
اپنا بھی اس سے پہلے کچھ اچھا زمانہ تھا

طبیعت میں صفائی گر نہیں تو خود نمائی کیا
کوئی آئینہ سازی سے سکندر ہو نہیں سکتا

کیسی تقسیم کی قسّامِ ازل نے ہے ہے
کہ بیاباں ہے مرا اور گلستاں اُن کا

پہن کر کوٹ اور پتلون اب جلسوں میں بیٹھے ہیں
مٹایا نام جنٹلمین بن کر کیا دوشالوں کا

دیکھ کر اُس صنم کو میں بُت ہوں
خاک سے بن گیا ہوں پتھر کا
دشمنی دوستوں نے کی مجھ سے
شور لکھا تھا یہ مقدّر کا

کیا کیا تھی آرزو ثمرِ نخلِ عشق کی
یہ پھل ملا کہ دل بھی پھپھولوں سے پھل گیا

تمام عضو ہیں بیکار ضعفِ پیری میں
رہے جو ایک دو باقی وہ کس حساب میں دانت

یہ لختِ دل ہے کسی سبز بخت کا ظالم
عقیق کا ہے جو تکمہ سرِ گریباں سُرخ

یہ گھٹنے بڑھنے کا جب نقص پڑ گیا اس میں
تو مہ جبینوں سے پھر کر گیا کنارہ چاند

ہے یقیں مجھ کو یہ تاثیرِ سیہ بختی سے
سر سے پا تک نہ مرے بال ہوں زنہار سفید

ہجر میں دیکھ چکے اُس کی بھی تاثیر کو ہم
اپنے مشرب میں جو ممنوع تھا گنڈا تعویذ
پختگی گر نہ ہو الفت میں تو کچھ لطف نہیں
کبھی دیکھا نہیں ہم نے ثمرِ خام لذیذ

مرنا درِ شیریں پہ تھا لازم تجھے ناداں
پتھر پڑیں فرہاد تری کوہکنی پہ

تو وہ یوسف ہے کہ اندھوں کو بصارت دیدے
داغ دیکھیں گے تجھے دیدۂ بینا ہو کر

مر کر ہمیں اس گریۂ طفلی کا کھلا حال
انجام کی آواز تھی آغاز کی آواز

جب آنکھ بند کی وہ تصور میں آگئے

کیا کیا ہے مجھ کو خانۂ وابستہ در سے فیض
شاگرد تیرے شور جہاں میں ہیں جا بجا
جاری سخن کا خوب ہوا تیرے گھر سے فیض

دل سا عزیز رکھ نہ سکے جب کہ پاس ہم
پھر اُن کے آگے کیا کریں اس جاں کی احتیاط

گلشنِ گیتی میں ہم بھی رنگ دکھلاتے ہزار
مثلِ گل کے کاش ہوتے ہم کبھی جو زر بکف

اہلِ صفا کا عرش سے رتبہ بلند ہے
آتا ہے زیرِ آب نظر آسمان صاف

رسائی کیونکر ہو نظارہ گاہِ یار پر اپنی
کہ جا سکتی نہیں پیکِ تصوّر کی نظر واں تک

کیا پوچھتے ہو سکھ میں تو اپنا ہر ایک ہے
پر دُکھ میں ہم نے پائے بہت لوگ کم شریک

خبر عمرِ رواں کی کچھ نہ پائی
رہا برسوں ہی اُس کو ڈھونڈھتا دل
چمن کی بے ثباتی جب کہ دیکھی
بشکلِ غنچہ سربستہ رہا دل

جسے کہتے ہیں شیطاں وہ یہی ہے

برائی کا ہے بیشک سرغنہ دل

کسی سے چھیڑ کسی سے ہنسی کسی سے مذاق
بڑھاپا بھی ہے ہمارا شباب میں داخل

خدا کے نور کا ہوتا نہ اس میں گر پرتو
تو بُت کے سامنے سجدہ کیا نہ کرتے ہم

بس ناصحا دماغ پریشاں نہ کر مرا
آفت میں ہوں تو میں ہوں کچھ آفت میں تو نہیں

کیا کوئی فرشتہ ہوں کہ بے رزق ہوں اے چرخ
شاید ترے نزدیک میں انسان نہیں ہوں

پیش جاتی نہیں اُن آنکھوں کے آگے شوخی
یہ وہ آہو ہیں کہ دنیا کو چرے بیٹھے ہیں

شادی و غم میں دم کے ساتھ رہیں گے تا ممات
مرنے سے پہلے پھر بشر ان سے فراغ پائے کیوں

بے ہنر کرسی نشینی سے نہ ہوگا باہنر
شیر قالیں صورت شیر ببر ہوتا نہیں

شب فرقت قیامت سے نہ تھی کم
کھنچا کی روح اور آہیں بڑھا کیں

یکساں مآل کار ہے شاہ و گدا کا یاں
محتاج بادشاہ بھی دو گز کفن کے ہیں

خاک اُڑائیں گے یار کے در پر
کیوں رہیں مثلِ قیس جنگل میں

دیکھی میری تڑپ جو مقتل میں
چھپ گئی برق جا کے بادل میں

آئے تھے ہم یہ سوچ کے سُکھ پائیں گے یہاں
دنیا تھی پوٹ دُکھ کی وہ ہم سے اُٹھی نہیں

غیر کی آنکھوں میں چبھتی ہیں شعائیں مہر کی
ہیں وہ شاید میری آہِ چرخ رس کی تیلیاں

گرچہ ہیں خاموش پر ہے لو لگی اُس کی طرف
بُت بھی ہیں مصروف بُت بن کر خدا کی یاد میں

نہ نکلا کچھ بتوں سے کام اپنا
بس اب میرا خدا ہے اور میں ہوں

خدا جانے کہ کیا ہو جائیں ہم کیا مرتبہ پائیں
ترا اے بُت ہے جتنا ڈر اگر اتنا خدا کا ہو

چلے ہیں بارِ عصیاں سر پہ لے کر
ہماری بار برداری تو دیکھو

کون سر پر ہاتھ آن کے رکھ سکے گا حشر میں
ان گنہگاروں پہ کچھ تیری ہی رحمت ہو تو ہو

رشک سے کیا دُرِ نایاب ہو پانی پانی
گر پڑے چشم سے گر ایک زمیں پر آنسو
دل سا عزیز پہلے ہوا نذرِ ناز کی
اب جان لڑ رہی ہے مری اُس نظر کے ساتھ

ہماری آنکھ کے آنسو زمیں پر گر کے کہتے ہیں
بلندی ہے جسے حاصل اُسے اک روز پستی ہے
عقل و حواس و ہوش تو کھو ہی چکا تھا میں
باقی رہی تھی جان سو وہ بھی نثار کی

نمک ایسا نہ حسن ایسا زباں ایسی نہ آنکھ ایسی
غنیمت اور اقلیموں سے ہے ہندوستاں پھر بھی

دیا بتوں کو جو دل آخر آدمی ہی تو تھے
فرشتے ہوتے تو کاہے کو ہم خطا کرتے

گل سا چہرہ کبھی تو کھلاؤ
جو ذرا دل کی بے کلی نکلے

مدعا کُھل گیا یہ مجھ پر آج
تم مری جاں کے مدعی نکلے

بیشک نہیں نکلتے ہو پردے سے تم مگر
حسرت بھی میرے دل کی بڑی پردہ دار ہے

میں جانتا تھا جور یہ میرے ہی ساتھ ہیں
غیروں کا حال دیکھ کے صبر آگیا مجھے

اے شبِ تار نکل بھی کہیں کالا منھ کر
اب تو ہونے لگا سایہ بھی گریزاں ہم سے
سچ اگر پوچھو تو ہے جینا ہی دشوار اسے
ورنہ مشکل ترے بیمار کو مرنا کیا ہے

ہماری عقدہ کشائی فقط دعا پر ہے
بتوں کے بندے ہیں لیکن نظر خدا پر ہے

ڈال کر سوڈا برانڈی میں یہ ساقی نے کہا
دیکھ لو جس نے نہ دیکھا ہو سنہرا پانی
ہائے نیکی کیوں نہ کی ہم نے کہ ہوتے سرخرو
اس بدی سے روزِ محشر سخت رسوائی ہوئی

نذر کو تیری فقط دم ہی لگا رکھا ہے
اور کیا پاس مرے اس کے سوا رکھا ہے

انتخاب دیوان پنجم

مرے ساتھ سلوک قضا نے کئے مجھے زیست کی فکر والم نہ رہے
مرے بار گناہوں کے ہلکے ہوئے کوئی رنج وعذاب ذرا نہ رہا

داغ دل پر میرے اعمالوں کے لاکھوں ہیں گواہ
اس لئے میں اپنا محضر آپ لکھ کر لے چلا

رُکے ہے آمد و شد میں نفس نہیں چلتا
یہی ہے حکم الٰہی تو بس نہیں چلتا
ہوا کے گھوڑے پہ رہتا ہے وہ سوار مدام
کسی کا اس کے برابر فرس نہیں چلتا
گزشتہ سال جو دیکھا وہ اب کی سال نہیں
زمانہ ایک سا بس ہر برس نہیں چلتا
نہیں ہے ٹوٹے کی بوٹی جہان میں پیدا
شکستہ جب ہوا تار نفس نہیں چلتا

ہر ایک بات پہ بن بن کے وہ بگڑتے ہیں
کسی کا ان کی طبیعت پہ بس نہیں چلتا
رکھا ہے وقت ہر اک کام کا خدا نے جبھی
ہزار فکر کرو پیش و پس نہیں چلتا
خدا نے راہ بنائی ہے صبر [illegible]
پہ اس پہ شور کبھی بوالہوس نہیں چلتا

میں اپنی سزا پانے کو سو فخر سمجھتا
گر میری طرف ایک بھی الزام نکلتا

اے طفل اشک کوچہ میں اُس کے نہ تو مچل
آخر کو پھر کسی سے اُٹھایا نہ جائے گا
دامن سے داغ خون کا دُھویا تو کیا ہوا
پر دل سے اُس کا نقش مٹایا نہ جائے گا

تمہارے عشق میں کیا کیا نہ اختیار کیا
کبھی فلک کا کبھی غیر کا وقار کیا
اسی خیال میں دن رات میں تڑپتا ہوں
تمہیں قرار بھی دوگے جو بے قرار کیا
یہ خیال بھی ہے عجب کیا جہاں نما
آیا نظر وہ پاس جو اپنے سے دور تھا
اُس ماہرو پہ آنکھ کسی کی نہ پڑ سکی
جلوہ تھا طور کا کہ سراسر وہ نور تھا
دیتے نہ دل جو تم کو تو کیوں بنتی جان پر
کچھ آپ کی خطا نہ تھی اپنا قصور تھا
ذرّہ کی طرح خاک میں پامال ہوگئے
وہ جن کا آسماں پہ سرِ پُر غرور تھا

بل بے اے جوشِ شہادت خون تھمتا ہی نہیں
ہوگئے قاتل کے دونوں ہاتھ اور شمشیر سُرخ

کہتے ہیں جس کو شفق یہ سب خیالی بات ہے
ہے کسی کے خونِ ناحق سے یہ چرخِ پیر سُرخ

مشبک گر جگر اور دل ہوئے ہیں تیرِ مژگاں سے
رہیں در پر پری زادوں کے یا رب جالیاں ہو کر

روح تھی صاف بگولے میں کسی وحشی کی
کھاتے ہیں اُڑ کے پہاڑوں سے جو چکّر پتھر
کھُل گئی آج شرارت بُتِ بے رحم کی شور
یہ جو پھکوائے ہیں اس نے مرے گھر پر پتھر

ٹھکانے لگی آج مٹی مری
کھڑے وہ رہے گور پہ دیر تک

ٹھہرا ہے روزِ حشر کو گو وعدۂ وصال
پر انتظارِ موت کی حالت سے کم نہیں

نہ اپنے حال کا غم اور نہ پوچھ مآل کی فکر
پھنسے ہیں اہلِ جہاں کس بلا کے دھندوں میں
نصیب بام تمنّا پہ ہو رسائی کیا
نہ ہم میں تاب و تواں اور نہ ہم پرندوں میں
تمہارے شور سے ہوں شورشیں [illegible]
کہ فنِ شعر سے ہو تم بھی ہم بلندوں میں

خدا کی شان آتی ہے نظر یا طور کا جلوہ
وہ جس دم روپ بھرتے ہیں سنورتے ہیں نکھرتے ہیں

ہوں محو ایسا دیدۂ میگوں کے عشق میں
پیمانہ دیکھتا ہوں میں ہر روز خواب میں
مجھ کو وہ قتل کرکے لگے خوں کو سُونگھنے
اس شبہہ سے کہ اس میں تمنّا کی بو نہ ہو

ترچھی نظروں سے جو دیکھا تھا عدو کو میں نے
وہ خفا ہوکے مجھے آنکھ دکھانے آئے

جورِ صیاد سے اور شوقِ رہائی سے بچے
لطف کچھ قید ہی میں بے پر و بال اچھا ہے

جیتے فراق میں جو رہے بھی تو کیا ہوا
سُن لینا ایک روز کہ بے آئی مر گئے
پسماندوں کو سپرد خدا کے کیا ہے شوؔر
اپنا نباہ جیسے ہوا ہم تو کر گئے

ایک سنتے نہیں کسی کی وہ
شکوہ پھر بار بار کون کرے

ہم خاک ہوئے خاک بھی برباد ہوئی ہائے
اور پھر بھی ترے دل سے کدورت نہیں جاتی

عمر بھر گردش میں گزری پر نہ پایا کچھ سُراغ
منزلِ مقصود اپنی ہائے قسمت دُور ہے
لو ذرا برقع اُٹھا دیجے دکھا دیجے جمال
آپ کی چشمک تجلّی میرا سینہ طور ہے

گزاریں گے ہر حال میں عُمر ہم
گذرتے گذرتے گذر جائے گی
نہ نکلے گا گر کام تم سے کوئی
قضا تو مرا کام کر جائے گی

میں وہ پروردۂ غم ہوں کہ ازل سے مجھ کو
نہ ملی تھوڑی سی فرصت کبھی غم کھانے سے
جامِ ہستی کا اب اپنا ہوا شاید لبریز
آج خالی جو پھرے آتے ہیں میخانے سے

کیا کہوں کس سے کہوں اک سخت حیرانی میں ہوں
دل میں لاکھوں ولولے ہیں پر زباں معذور ہے

انتخاب دیوان ششم

وہ بھی غوغا سن کے آئے دیکھنے کو بام پر
تھا دلِ مضطر کا نقشہ نقش اک تصویر کا
دیکھ کر اس کو خموشی سب کے منہ پر چھا گئی
ہے غضب حیرت فضا عالم تری تصویر کا

تھی گل و شبنم کی صحبت وقتِ رخصت صبحدم
ہنس کے جانا اُس کا میرا چشمِ تر سے دیکھنا

انصاف فی زمانہ تو عنقا صفت ہوا
نکلی عدالتوں میں وہ ردوبدل کی شاخ
باغِ معاش کیوں نہ ہو خشک اب جہان میں
نخلِ ملازمت میں لگی ہے مڈل کی شاخ

نہ ملا کچھ نشانِ عُمرِ رواں مٹ گئی اپنی عمر بھر کی تلاش
یہ خدا سے جدا بھی کرتا ہے ہو زیادہ نہ سیم و زر کی تلاش

غمِ دنیا ہے اور فکرِ نجات
ان سے بڑھ کر ہے کیا جہنم میں
حُسن پر تم کو عشق پر ہمیں ناز
فرق پھر کیا ہے تم میں اور ہم میں

دردِ دل کس سے کہوں داد میں کس سے چاہوں
میری سنتے بھی نہیں شکل دکھاتے بھی نہیں
جب خدا ہی نہ اس کے دل میں ہو
چاہ کر بُت کو کیا کرے کوئی

دوستی میں جو دشمنی کر جائیں
اُن سے پھر کیوں ملا کرے کوئی

دیکھا بغور کوئی نہیں اپنے میل کا
جز خاک کون اپنے میں ہم کو ملا سکے

اثر سوزِ جگر کا قیس کے ہے غور سے دیکھو
کہ اب تک پھرتے ہیں ہر ایک صحرا میں ہرن کالے

ستارے شرم سے ٹوٹے زمیں پر
جبیں سے تیری جب افشاں جھڑی ہے

نظم معرفت

عدم سے ہستی میں جب ہم آئے نہ کوئی ہمدرد ساتھ لائے
جو اپنے تھے وہ ہوئے پرائے اب آسرا ہے تو بیکسی کا
جہاں میں زر کا ہے کارخانہ نہ کوئی اپنا نہ ہے یگانہ
تلاش دولت میں ہے زمانہ خدا ہی حافظ ہے مفلسی کا

دل میں اپنے آرزو سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
دو جہاں کی جستجو سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
ہے تلاش دو جہاں لیکن خبر اپنی سے
جیتے جی تک جستجو سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
اے خیال و خواب ہے اے شور یہ بزم جہاں
یار اور جام و سبو سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں

اے جان کام اس نے ہمارا یہ تو ہے
یہ کام آج تک نہ کسی سے ہوا نہیں

اے شوؔر تو نہ چھوڑنا دامن مسیح کا
ایسا نہیں ہوا ہے کوئی رہنما کہیں

بنا سب دن سے نورانی بڑا دن
کہ رشکِ ماہ و خور بیشک ہوا دن
مسیحا نے قدم دنیا میں رکھا
بزرگی سب نے پائی سر چڑھا دن

ولا رہے گی نہ یہ جان اور نہ تو باقی
جہاں میں نام رہے گا فقط نکو باقی
غرض نہ دین سے مجھ کو نہ کام دنیا سے
فقط ہے تیری عنایت کی آرزو باقی
کدھر وہ بزم گئی شوؔر اور اہلِ سخن
کہ ہے نہ میر نہ سودا نہ آبرو باقی

کوئی چیز ہوتی جو پُر اثر تو ہر ایک رکھتا عزیز تر
نہ کسی کے کام کے نکلے ہم نہ کسی مرض کی دوا ہوئے

تخمیس غزل ظفرؔ

کچھ نہ کی تیری بندگی ہم نے
عمر ضائع کی مفت ہی ہم نے
جب عبادت میں کی کمی ہم نے
خاک دنیا کی سیر کی ہم نے

تخمیس غزل سفیرؔ

تری فرقت میں جیتے ہیں ہمیں شرمندگی یہ ہے
بُلا لے پاس اپنے اب تمنائے دلی یہ ہے
چلیں دنیائے دوں سے سب کی نظروں میں بُری یہ ہے
محبت میں تری ہم مرمٹیں بس زندگی یہ ہے

لگتا نہیں ہے دل جو یہاں پر کسی طرح
نقشہ بگڑ گیا ہے کچھ اس کائنات کا

سب اس آمد و شد کا ہوا معلوم یہ ہم کو
مسافر خانہ ہے دنیا پھر اس میں ہے وطن کس کا
جو آیا عالمِ فانی میں جائے گا وہ پھر اک دن
خوشی کس کی کریں ہم اور یہاں رنج و محن کس کا

ہر انساں کو دنیا میں کیا چاہئے
شب و روز یادِ خدا چاہئے
میسّر ہو گر خاکِ پائے مسیحؑ
نہیں ہم کو پھر کیمیا چاہئے
خدا کا کرم اور مسیحا کا فیض
نہ کچھ دولت اس سے سوا چاہئے
چلو شوؔر اب تم بھی اپنے وطن
نہ پردیس میں اب رہا چاہئے

یہ گل کو چمن دہ سے آ نکلے تھے
یہ نہ سمجھے ہمیں کل سینے پہ لگانا ہوگا۔

رباعیات

گرجا میں گئے تو پارسائی دیکھی
اور دیر میں جاکے خود نمائی دیکھی
جب چھوڑا خودی کو غور کرکے اے شور
دیکھا تو ہر اک سمت خدائی دیکھی

کعبہ میں تو صدق اور صفا کو پایا
بُت خانہ میں ناز اور ادا کو پایا
حاصل نہ ہوا کہیں سے دل کا مقصد
جب خود ہی میں ڈھونڈھا تو خدا کو پایا

کچھ تیرا ثمر نہ اے جوانی پایا
سرما زدہ باغ زندگانی پایا
جی خاک لگے شور کہ اس گلشن میں
جو پھول کھلا اُسی کو فانی پایا

ہر شخص دیکھتا ہے ہمیشہ مآل کو
اس واسطے میں دیکھ رہا ہوں ہلال کو

کچھ کام نہیں گبرو مسلمان سے ہمیں
ہے کفر سے کچھ بحث نہ ایمان سے ہمیں
رہنے کے لئے دیر و حرم ہیں یکساں
اک روز سفر کرنا ہے پھر یاں سے ہمیں

جب تک ہے شباب سازگارِ دولت
ہر قصر میں سو نقش و نگارِ دولت
پیری آئی تو شورؔ صاحب پھر کیا
سب خاک میں مل گئی بہارِ دولت

دولت نے معاودت جو کی تو کیا کی
طالع نے مساعدت جو کی تو کیا کی
پیری میں نہیں فائدہ کچھ بھی اے شور
دنیا نے موافقت جو کی تو کیا کی

پیری میں خاک زندگانی کا مزہ
دانے کا ہے لطف اور نہ پانی کا مزہ
وہ میکشی و ذوق کہاں ہے اے شور
تا مرگ نہ بھولیں گے جوانی کا مزہ

کیا وصف لکھوں زلف سیہ کی لٹ کا
ہر پیچ میں اک دل کو لیا ہے لٹکا
اے شانہ زہے قسمت عالی تیری
کیا خوب ترے ہاتھ لگا ہے لٹکا

حوالہ جات

(1) خم خانۂ جاوید، جلد پنجم، مؤلفہ لالہ سری رام، ص 71، ناشر لالہ امیر چند کھنہ، 17 علی پور روڈ، دہلی
(2) دبستانِ میرٹھ (مخطوطہ)، مشتاق شارق
(3) خم خانۂ جاوید، جلد پنجم، مؤلفہ لالہ سری رام، ص 71، ناشر لالہ امیر چند کھنہ، 17 علی پور روڈ، دہلی
(4) ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دلی 2003
(5) جارج پیش شور، دیوان سوم، ص 40
(6) جارج پیش شور، دیوان دوم، ص 192
(7) جارج پیش شور، دیوان ششم، ص 2، 3

راحت ابرار کا شمار ملک کے ممتاز قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے مضامین تقریباً تیس برس سے ملک اور بیرونِ ملک کے مختلف اخبارات، رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ 23/دسمبر 1955ء کو باغپت ضلع کے رٹول گاؤں میں پیدا ہوئے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی مسلمانوں کی تعلیم سے انہیں گہری دلچسپی رہی ہے، اس لئے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر انہوں نے سب سے زیادہ مضامین لکھے ہیں اور ان کے تحقیقی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

راحت ابرار نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اور ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار شاگردِ غالب حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی پر انہوں نے پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھا جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

راحت ابرار کو اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل ہے اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے افسر رابطۂ عامہ جیسے مصروف ترین عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی وہ تخلیقی اور تحقیقی سرگرمیوں میں منہمک رہتے ہیں۔

اردو کے فرانسیسی شاعر اور ادیب جارج پیش شور پر انقلاب 1857ء کے حوالے سے انہوں نے جو تحقیقی کام کیا ہے اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اپنے موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے اس کی حوالہ جاتی حیثیت روز بروز زیادہ مستحکم ہوگی۔

ڈاکٹر راحت ابرار نے جارج پیش شور کے حالاتِ زندگی، ان کی تاریخی ڈائری اور شاعرانہ اہمیت پر تفصیلی تحقیقی ابواب لکھے ہیں۔ یوں انہوں نے عہدِ غالب کی ایک اہم گمشدہ کڑی کو جوڑ دیا ہے جس کے لئے تاریخِ ادبِ اردو ان کی ہمیشہ ممنون رہے گی۔

گوپی چند نارنگ

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com